دنیا
کے

شاہکار افسانے

دوسرا حصہ

انگریزی افسانے

مدیر عبدالقادر سروری
معاون مدیر محمد محی الدین

ناشر
انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۳۱ء

تعداد (۵۰۰) مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن قیمت (عہ)

دنیا کے

شاہکار افسانے

به ادارت

جناب مولوی عبدالقادر سروری صاحب ام، اے، ال، بی (عثمانیہ) مددگار پروفیسر اردو
کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۱) قدیم افسانے — شائع ہوچکا — قیمت عہ
(۲) انگریزی افسانے — " — "
(۳) جرمنی افسانے (زیر ترتیب) بہ اعانت عزیز احمد صاحب
(۴) فرانسیسی افسانے (زیر طبع)
(۵) اطالوی افسانے (زیر ترتیب) " مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے
(۶) ہسپانی افسانے (") " فیض محمد صاحب صدیقی بی۔ اے
(۷) چینی اور جاپانی افسانے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا قیمت ۹؍
(۸) ولندیزی اور دیگر افسانے (زیر ترتیب) بہ اعانت عزیز احمد صاحب
(۹) روسی افسانے (") "
(۱۰) پولی و دیگر افسانے (") " محمد محی الدین صاحب
(۱۱) بلجمی افسانے (") " و فیض محمد صاحبان
(۱۲) جدید اسلامی افسانے (") مدیر
(۱۳) امریکی افسانے (") " محمد محی الدین صاحب
(۱۴) بہترین اردو افسانے (") مدیر

فہرست

دیباچہ

دیباچہ

"شاہکار افسانے" کا یہ دوسرا حصّہ عوام کے سامنے پیش ہے۔ اس سے پہلے دو حصے "قدیم افسانے" اور "چینی اور جاپانی افسانے" شائع ہو چکے ہیں مختلف حصوں کی اشاعت میں سلسلہ قائم رکھنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ ہر حصہ جیسے تیار ہوا' شائع کر دیا جا رہا ہے کیونکہ ہر ایک حصہ انفرادی دلچسپی رکھتا ہے اور کوئی کسی پر منحصر نہیں ہے برطانوی مصنفین کے شاہکار کا یہ منتخب مجموعہ ہے یقین ہے کہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔ قصہ نگاری کے ارتقا سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بھی اسکا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہ پورے برطانیہ کے مختصر قصوں کا زمانی خاکہ ہے۔ اس حصہ کے اکثر قصّے ہندوستان کے میقاتی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں اور پسند بھی کئے گئے مجھے امید تھی کہ یہ حصہ ہر طرح قابل اطمینان ہوگا۔ لیکن محمد محی الدین صاحب' جنھوں نے بڑی محنت سے اس کے اکثر قصوں کا ترجمہ کیا ہے' بیمار ہو گئے تھے اسی سبب سے اسکی اشاعت میں بیحد تاخیر ہوئی۔ اور کام بھی میری خواہش کے مطابق انجام نہ پا سکا۔ کاتب نے بھی دقتوں میں کچھ کم اضافہ نہیں کیا۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود یہ کام اپنی نوعیت کا پہلا ہے تمام انگریزی منتخب مختصر قصے اردو میں شاید ہی کہیں ایک جگہ زمانی ترتیب میں جمع کئے ہوئے دستیاب ہو سکیں ضمنی فروگذاشتیں آئندہ باقی نہیں رہینگی۔

"شاہکار افسانے" کا تیسرا حصہ "فرانسیسی افسانے" زیادہ احتیاط اور خوبی کے ساتھ سر انجام پایا ہے یہ حصہ زیر طبع ہے۔ توقع ہے کہ وہ اس سلسلہ کے آئندہ حصوں کا ایک موزوں نمونہ ہوگا۔

عبدالقادر سروری

برطانوی قصے

تمہید

برطانوی مختصر قصے بہت قدیم ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ خود انگریزی زبان کی تدوین سے پہلے ساتویں یا آٹھویں صدی عیسوی میں بھی ان کا وجود تھا۔ اور بعض اس نظریہ کے موید ہیں کہ انگریزی مختصر قصے اڈیسن سے شروع ہوتے ہیں۔ بہرحال ہمارے مقصد کے حصول کیلئے ہم قدیم سے قدیم انگریزی مختصر قصے کو اس میں شامل کر سکتے ہیں۔ پہلے نظریہ کے موید اپنے بیان کے ثبوت میں اینگلوسیاگزن قصوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ بیارٹ کلارک اور سکیم لیبرنے اپنے "دنیا کے بہترین مختصر قصے" کے مجموعہ میں اینگلوسیاگزن قصے "حملہ گرینڈل" کو پہلا برطانی قصہ تصور کیا ہے۔ چونکہ یہ زیادہ دلچسپ اور ہمارے مفید مطلب نہیں ہے اس لئے ہم اسے قطع نظر کر کے جیوفری مان متھ کے قصے سے اس کی ابتدا کرتے ہیں۔

اس مختصر سی تمہید میں اس کا موقع نہیں ہے کہ ہم برطانوی مختصر قصوں پر فرانسیسی، جرمنی، اسکینڈنیوین اور دیگر ممالک کے اثرات

مفصل پیش کریں۔ ہر میشہ کے لوگ قصوں میں ابتدا سے دلچسپی لیتے رہے۔ ان مصنفین میں جو میالری سے پہلے انگلستان میں موجود تھے جیوفری آف مان متھ بہت مشہور ہے۔

چاسر انگریزی شعرا کا پیش رو ہے۔ لیکن اس کے قصے مختصر اور دلچسپ نہیں ہیں۔ اس کے معاصرین میں لیاٹکلینڈ اور گور کے قصے تناسب اور سلاست رکھتے ہیں۔ چاسر کے بعد سے "گسٹا رومانرم" کی اشاعت تک بہت کم مختصر قصہ نگار پیدا ہوئے۔ لیکن اطالوی احیائے علوم کی تحریک کے بعد سے اطالوی بوکاچیو کے قصے ترجمے اور تقلید کے ذریعہ انگریزی میں منتقل ہونے لگے۔ انگریزی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پیالس آف پلیژرس" ۱۵۶۶ء میں شایع ہوا تھا۔ اس سے شکسپیر کے بعض ڈرامے بھی ماخوذ ہیں۔ عہد الزبتھ تک بھی اطالوی قصے تو انگریزی زبان کے جز نہیں بن سکے تھے۔ تاہم گرین نے بعض قصوں کی اچھی نقل اتاری ہے اس کے بعد طامس دی لونی کے قصے قابل مطالعہ ہیں۔ دوسرے قصہ نگار۔ پی لی اور لاج قدیم قصوں ہی کا اتباع کرتے رہے۔ الزابتھ اور این کے درمیانی وقفہ میں بھی بہت کم مختصر قصے قابل توجہ لکھے گئے۔ لیکن اڈیسن اور ڈیفو کے بعد سے مختصر قصوں کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ اڈیسن نہ صرف مالک اسلوب کی حیثیت سے مشہور ہے بلکہ اس کے قصے جو عموماً "اسپکٹیٹر" میں شایع ہوتے رہے۔ انگریزی تمدن اور معاشرت کے اچھے نمونے اور ادبیات کے نولور ہیں۔ ڈیفو کے کارناموں میں "رابن سن کروسو" کے علاوہ "دی کاک لین گھوسٹ" اور "دی اپاریشن آف مسز ویل" بہت ہی دلچسپ ہیں۔

جس طرح کے اخلاقی قصے اڈیسن اور اس کے شریک کار اسٹیل نے لکھے تھے، ان کا سلسلہ ان کے بعد ہاکس ورتھ، جانسن اور گولڈ اسمتھ

نے جاری رکھا۔ طویل ناول لکھنے والے بھی اپنے افسانوں میں مختصر قصے بیان کرنے لگے تھے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک بھی بہت ہی کم ایسے انگریزی مختصر قصہ نگار پیدا ہوئے جن کے کارنامے اس فن میں اضافہ سمجھے جاسکیں۔ اسکاٹ اور ڈکنز نے بعض مختصر ناول لکھے ہیں اور بعض دوسرے مصنفین مثلاً لور اور کارلے ٹن نے بھی مختصر قصے لکھے جن میں کردار نگاری بہت اچھی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزی مختصر قصے انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے پہلے ارتقائی صورت نہ حاصل کرسکے۔ اس صدی کا نصف آخر سارے یورپ اور امریکہ میں مختصر قصہ نگاری کا معراج کمال ہے موجودہ مختصر قصہ نگاروں کے نام گنوانا یہاں غیر ضروری ہے۔

عموماً عہد وکٹوریہ کا ہر قصہ نگار مختصر قصوں کے لکھنے پر بھی پوری طرح قادر تھا۔

اس دور میں انگریزی مختصر قصہ نگاری کے بہت سے خصوصی ماہر فن پیدا ہوئے۔ ان میں کپلنگ، مارلین، جیاکوبس، اور ہیریک خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ انھوں نے مختصر قصے کو ایک علٰحدہ فن بنالیا جس کے سنوارنے میں اپنی عمریں وقف کردیں۔ قصوں سے قطع نظر اس فن کے متعلق بھی کافی لٹریچر پیدا ہوچکا ہے۔

معصوم شہزادی

جیوفری آف مان متھ ۔ ۱۱۰۰ - ۱۱۵۴ء

جیوفری کا حال یقین کے ساتھ معلوم نہیں۔ غالباً وہ ویلز نژاد تھا اور شاہ آرتھر اور اس کے نائٹس کی رہائش گاہ کے قریب ہی اس کا مکان

تھا۔ اس لئے ایک تاریخ لکھی تھی جس کو نقادوں نے "داستانی تاریخ" لکھا ہے۔ اس کے اگلے ابواب میں قدیم برطانوی بادشاہوں کے متعلق قصے بیان کئے گئے ہیں۔ اگلی انگریزی کہانیوں میں ذیل کا قصہ بہترین ہے۔

اصل قصہ لاطینی میں تھا۔ اس کا ترجمہ تو سیاننسر نے کیا۔ اسی سے محمد محی الدین صاحب نے اس کو اردو میں منتقل کیا۔

دو موم شہزادی

تقریباً تین ہزار سال قبل ایک خوفناک جنگجو سردار ہیمبرن نامی تھا۔ جس کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ لا تنا ہی سمندروں پر سفر کیا کرے اور ساحلوں پر اتر کر جنگ اور غارتگری کے ذریعہ کاریگروں اور مزدوروں کی محنت شاقہ سے پیدا کی ہوئی املاک چھین لے جائے۔ وہ اناج کے خرمنوں سونے چاندی کے خزانوں اور قیمتی ملبوسات کی لوٹ پر ہی قانع نہ تھا بلکہ اکثر جلتے ہوئے گھروں سے خوبصورت بچوں۔ نوجوان لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کو جو اپنے مقتول عزیزوں کا ماتم کرتی ہوتیں، اٹھالے جاتا جہاں ان کو اس کی ظالم بیوی کی کنیزیں بن کر رہنا پڑتا۔

ایک دفعہ ہمبر نے ایک بڑے حملہ کا انتظام کیا اور دریائے آلبس کو عبور کر کے اس کے کنارے سے جرمن بادشاہ کی خوبصورت دختر کو اٹھالے

گیا جو اپنی محل کے سامنے سبزہ زار پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ پھر اس نے فریسیا کے ساحل پر قیام کیا۔ یہاں اس نے سنا کہ جزیرہ آلبین میں اتنی دولت چھپا ہے کہ جس کی مثال دنیا بھر میں نہیں ملسکتی۔ جزیرہ آلبین کا نام وہاں کے بادشاہ بروکٹس کے نام پر برٹین رکھا گیا تھا۔ یہ حال سنکر ہمیر نے اپنے جہازوں کا رخ شمال کی طرف پھیرا اور جزیرہ کے اس حصہ پر قیام پذیر ہوا جو گریٹ بیر کے قریب واقع ہے۔ اور جس کا نام اس وقت آلبانی تھا۔ یہاں اس نے اپنے خوفناک بحری ڈاکوؤں کے ساتھ آلبانا کٹس نامی بادشاہ کو شکست دی جو اس حصہ ملک کا حکمراں تھا اور ناتجربہ کاروں کو لیکر مقابلہ کے لئے آیا تھا۔ کیونکہ ایک تو وہ حال ہی میں تخت نشین ہوا تھا۔ دوسرے حملہ اچانک کیا گیا تھا۔

ہمیر نے اس فتح کی بڑی خوشی منائی اور البانا کٹس کے محل میں جشن عام کیا۔ اودے پہاڑ کی دلفریب قطاروں۔ مچھلی سے اٹی ہوئی جھیلوں اور شکار سے بھرے ہوئے جنگلوں والے ملک کو جلدی سے چھوڑ دینے کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ اس نے شکار کھیلے۔ دعوتیں اڑائیں۔ جشن کئے۔ اور اس قطعہ زمین کے شیرین میووں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے غیر آباد بنانا اور اجاڑنا شروع کیا حتیٰ کہ موسم گرما کا شباب ڈھل گیا۔ یہ خبر پہنچی کہ آلبانا کٹس جو میدان جنگ سے فرار ہو گیا تھا آزمودہ سپاہیوں کی کثیر تعداد فوج لئے ہوئے اس کے استقبال کو آ رہا ہے۔ یہ فوج اس کے بھائی لاکرینس نے کمک کے طور پر روانہ کی تھی جو اس زمانہ میں برٹین کے اس جنوبی حصہ کا بادشاہ تھا جس کا نام لیوگریا تھا۔ لاکرینس بھی بعد میں آکر اپنے بھائی سے راستہ میں مل گیا۔

ہمبیر اپنے جہازوں پر سوار ہو کر سمندر کے راستہ سے فرار ہو سکتا تھا۔ جس کا ایسے موقعوں پر وہ عادی تھا۔ مگر عرصہ دراز سے کوئی شکست نہ پانے اور ہمیشہ ظفریاب رہنے کی وجہ سے وہ مغرور ہو گیا تھا اور دشمن کو حقیر سمجھنے لگا تھا۔ اس لئے اپنی عیش و عشرت میں مشغول فوج اکٹھا کی اور ٹوٹے پھوٹے سامان کے ساتھ دونوں بھائیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ان دونوں کو قتل کر کے وہ ان کی مملکتوں پر قابض ہو جائیگا۔ مگر تقدیر اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ دونوں فوجیں ایک بڑے دریا کے کنارے جو جزیرہ کے درمیان میں سے گذرتا تھا۔ آمنے سامنے اتریں۔ کیونکہ دونوں بھائی دشمن کے سامنے موجود ہوتے ہوئے دریا کو عبور کرنا دانشمندی کے خلاف سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ڈیرے ڈالدیئے تاکہ کشتیوں کا پل بنا کر دریا کو بحفاظت تمام عبور کریں۔ مگر ہمبیر کے جہاز اس کے ساتھ تھے۔ جلدی کر کے وہ اپنے جہازوں پر سوار ہو گیا اور سمندر کو دریا کے دہانے پر عبور کرتے ہوئے اس کی فوج چیختی چلاتی اور فخریہ اشعار پڑھتی ہوئی دشمن پر حملہ آور ہوئی ان میں کوئی باقاعدگی اور انتظام نہ تھا اور وہ کسی باقاعدہ فوج کے بجائے شرابیوں کا مجمع معلوم ہو رہا تھا۔

غرض گھمسان کا رن پڑا اور آخر کار جرمنوں نے جان لیا کہ برٹین کی شجاعت کس کا نام ہے۔ اور اپنی غیر عاقلانہ لاف و گزاف کا متاسفانہ اقرار مقتولین کے ایک انبوہ کثیر کی صورت میں کیا۔ ان کا سردار ہمبیر جہاز پر سوار ہو بھاگا۔ مگر جہاز ڈوب گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کا فرعونی سر بھی۔ دریا اب تک اس واقعہ کی یاد دہانی کرتا ہے۔ کیونکہ لوگ اسے ہمبر دی رن کے نام اور شکست کی یادگار

کے طور پر دریائے ہمبر نام دیدیا۔

جب ہمبر ڈوب مرا تو اس کی پسماندہ پریشان فوج نے ہتیار ڈالدیئے اور خود کو شاہ لاکرنیس اور البانا کٹس کے رحم وکرم کے سپرد کردیا۔ انھوں نے عفو ومہربانی سے کام لیکر ان کی خطائیں معاف کیں اور اپنی فوج کو انعام دینے کے بعد بچی ہوئی زمینیں پر ان کو کاشت کرنے کی اجازت دیدی اور حکم دیا کہ جب تک کہ وہ پیداوار جسمع نہ کر سکیں انہیں مفت اناج مہیا کردیا جائے۔ پھر وہ کل خزانہ جو جہاز پر جمع تھا۔ پادشاہوں کے آگے لایا گیا۔ اور قیمتی ملبوسات بیش بہا ظروف۔ مغرب سے لوٹے ہوئے چمکدار اسلحہ بیش قیمت قالین اور جواہرات کا ایک انبار جو نہ معلوم کتنے ملکوں کو لوٹ کر اور کتنے بادشاہوں کو قتل کر کے حاصل کئے گئے تھے ان کے سامنے لائے گئے۔ ابھی وہ مال غنیمت کا ملاحظہ کر رہے تھے کہ سپاہیوں نے جرمن شاہزادی اسلیٹ کو گرفتار کر کے حاضر کیا جو بادبانوں میں چھپی ہوئی کھڑی تھی۔ کیونکہ واقعات کے قطعی انقلاب کے باوجود وہ نہ جانتی تھی کہ اس کا کیا حشر ہوگا۔

طویل قدوقامت والے برٹنوں کے جنگجو اندازاسے تذبذب کر رہے تھے۔ مگر جب لاکرینس نے اس کے جمال وحسن کو دیکھا تو وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اسلیٹ کی بھی قطرتیجی ہو گئی۔ اس نے لانبے لانبے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور اس کے دل میں دفعتاً عشق ومحبت کی ایک چنگاری سی بھڑک اٹھی لاکرینس ٹکٹکی باندھے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا گویا وہ کسی زبردست سحرکاری کا برا مسحور ہے اور اپنی آنکھ ہٹا نہیں سکتا۔ آخرکار وہ ہوش میں آیا اور بڑی کوششوں کے بعد بات کرنے کی ہمت ہوئی اور شہزادی

انہوں نے خوش آمدید کہا۔ اس کی مردانہ آواز مگر رحمدل الفاظ نے ایسلٹ کو اپنی امید سے چمکتی ہوئی آنکھیں اٹھانے پر مجبور کیا۔ جب اس نے شاہزادے کی عریض پیشانی اور شباب و محبت سے لبریز آنکھوں کو دیکھا تو اس کے گالوں پر شرم کی سرخی دوڑ گئی۔

لاکرینس کی نظر کے سامنے زمانہ کے عروج و زوال کی تصویر کھنچ گئی۔ مگر چونکہ شہزادی کو لونڈیوں کی طرح عام دربار میں مقید کھڑا رکھنا اسے شاق گذر رہا تھا۔ اس لئے اس نے حکم دیا کہ اس کو رہا کر کے پوری عزت کے ساتھ ایک علیحدہ خیمہ میں ٹھیرایا جائے اس کے جانے کے بعد لاکرینس نے اپنے بھائی سے یوں کہا۔

"بھائی! بڑے بڑے جہاز کل مال غنیمت اور یہ تمام قیمتی چیزیں تم لے لو۔ کیونکہ اس بحری ڈاکو نے تمہارا خزانہ خالی کر دیا ہوگا۔ مگر اس جرمن شہزادی ایسلٹ کو مجھے دیدو۔ میری روح اس کے لئے تڑپ رہی ہے اور وہ بھی اعلیٰ خاندان سے ہے اور میری ملکہ بننے کے لئے بالکل موزون ہے"

"افسوس۔ میرے بھائی۔" آلیاناکٹس نے جواب دیا" تمہارے دماغ میں یہ کیا سودا سمایا ہے مقید شہزادی خوبصورت بھی سہی اور اعلیٰ خاندان بھی مگر کیا تمہاری منگنی کارینوس کی دختر سے نہیں ہو چکی ہے؟ جو ہمارے والد کا آزمودہ حلیف ہے؟ کیا تم گوینڈولن کو بھول گئے؟ کیا تم خیال کرتے ہو وہ مغرور سردار یہ سنکر خاموش ہو رہے گا۔ کہ اس کی بیٹی ایک معمولی قیدی کے مقابلہ میں رد کر دی گئی ہے

لاکرینس کا چہرہ غم سے سیاہ ہو گیا۔ اور بھاری دل سے اس نے یوں جواب دیا۔

"میں نے مغرور گوینڈولن سے کبھی محبت نہ کی اس سے محبت

کر کون سکتا ہے؟ مگر چونکہ اس کا باپ کارنیوس اس رشتہ کا متمنی تھا۔ اور میں بھی اس کو دشمن بنانے کی نسبت دوست رکھنا ہی مناسب خیال کرتا تھا۔ اس لئے میں نے قبول کر لیا۔ مگر بھائی اس وقت کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جس سے میں شادی کرنے کا خواہشمند ہوتا۔ دنیا کی سب عورتیں میرے لئے برابر تھیں۔ اب تو میں اس حسین شہزادی کے لئے مرنے پر تیار ہوں۔"

اسے اتنا مصر دیکھ کر آلبانا کٹیس خاموش ہو رہا۔ اور اپنا مال غنیمت جمع کر کے اور بھائی کی وقتیہ امداد کے صلہ میں بیش قیمت تحایف اسے دیکر اپنے ملک کی طرف کوچ کیا۔ جہاں امن اور قانون کے قیام کے لئے اس کی سخت اور فوری ضرورت تھی۔

بھائی کے چلے جانے کے بعد لاکرینس نے اسلیٹ سے شادی کر لی اور دونوں خوش و خرم اپنی زندگی بسر کرنے لگے۔ اسلیٹ ویسی ہی دور اندیش اور عقلمند تھی جیسی وہ حسین تھی۔ وہ لاکرینس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کا ربائی دہندہ تھا۔ اس لئے وہ اس پر ایک حقیقی بیوی کی الفت اور شریف شہزادی کے عشق کے ساتھ فریفتہ تھی مگر جب کارنیوس نے سنا کہ لاکرینس نے کسی غیر ملکی شہزادی سے شادی کر لی ہے اور وہ تخت پر اس کے پہلو میں جلوہ افروز ہوتی ہے جو درحقیقت اس کی اکلوتی بیٹی گوئنڈولن کی جگہ ہے تو اس کے غصہ کا پارہ حد سے گذر گیا۔ اور اس نے قسم کھائی کہ یا تو وہ لاکرینس کو اپنی موجودہ ملکہ کو چھوڑ کر گوینڈولن سے شادی کرنے پر مجبور کرے گا۔ یا پھر دونوں میں کوئی ایک دنیا میں زندہ نہ رہے گا۔ کارنوال کے دیو قامت سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد جمع کر کے اور گوینڈولن کو اپنے ساتھ لیکر وہ مشرق کی جانب

روانہ ہوا۔ شہروں اور گانوؤں میں سے ایک حشر خیز طوفان کی طرح سے گذرتا تھا۔ کیونکہ غصہ اسے جب تک انتقام نہ لے لے کسی پہلو چین نہ لینے دیتا تھا۔

بادشاہ لاکرینیس نے جونہی اس کی آمد کی خبر سنی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مقابلہ کی اس میں تاب نہ تھی۔ اس لئے اس نے اپنی ملکہ کو ایک کسان کی دور افتادہ جھونپڑی میں چھپا دیا اور یہ افواہ اڑائی کہ اسقاط حمل کی وجہ سے وہ اور اس کا بچہ دونوں اس جہاں سے گذر گئے۔ اس قصہ کو اصلیت کا رنگ دینے کے لئے اس نے مراسم تجہیز و تکفین بھی ادا کئے۔ اور ماتمیوں کا لباس پہن لیا۔ کارینوس کو راستہ میں یہ خبر ملی اور اس کا غصہ کسی حد تک ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے ایک ایلچی لاکرینیس کے پاس بھیجا کہ وہ لیڈی گوینڈولن کے معاملہ میں اپنے عہد کو پورا کرے۔

بادشاہ کو رنج تو بہت ہوا مگر قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا اس نے استدعا کی کہ کم از کم شادی کچھ دنوں کے لئے ملتوی کی جائے تاکہ وہ اپنی دلہن سے ملنے اور اس کو دیکھنے کا شرف حاصل کرنے کے لئے کچھ تیاریاں کر لے۔ مگر کارینوس تاخیر کے متعلق کچھ سن نہ سکتا تھا۔ اس نے کوچ جاری رکھا۔ اور اچانک ٹرائنوانٹ کے شہر میں داخل ہوا۔ جو لاکرینیس کا دار السلطنت تھا۔ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسری میں اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ بادشاہ کے دربار میں گھس گیا اور اس کو اسی وقت شادی کرنے اور گوینڈولن کو ملکہ بنا کر اپنے تخت پر بٹھانے کا حکم دیا۔

کارینوس کا خوفناک چہرہ کچھ تو بڑھاپے کی جھریوں اور کچھ

غصہ کی شدت کی وجہ زیادہ بھیانک بن رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اطراف سخت اور سفید بالوں کا ایک حلقہ تھا۔ جس میں اس کا آدھا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ خزاں کے بادل کی طرح پریشان۔ سفید داڑھی۔ جس کا ایک ایک بال کھڑا ہوا اس کی پیشانی کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور دانت بھینچے ہوئے۔ آنکھیں ابل رہی تھیں۔ اس کے ننگے بازوؤں کے اعصاب سانپوں کی طرح نمودار تھے۔ گہرے اودے رنگ کے موٹے سے کپڑے کا ایک ڈھیلا لباس اس کے چوڑے سینہ کو چھپا رہا تھا کارنیوس کے ساتھی بھی اس سے کچھ کم دہشتناک نہ تھے۔ قد میں طویل ارادہ میں مصمم۔ اور حرکات میں بے رحم اور وحشی۔ وہ فقط اپنے سردار کے ایک اشارہ کے منتظر تھے تاکہ صلح پسند شہریوں کے مکانوں کو آگ لگادیں ان کو مع زن و مرد کے قتل و غارت کردیں اور بادشاہ کا خود اس کے دربار میں سرمہ بنا ڈالیں۔

لاکرینس نے مجبور و پریشان ہو کر منظور کرلیا۔ پادریوں نے جن کو کارنیوس اپنے ساتھ لایا تھا۔ ماتمی لباس میں ملبوس دولھے کو غصہ میں بھری ہوئی دلہن کے ساتھ ملانے کے مراسم ادا کئے اور مغرور گوئینڈولن اسپلٹ کی جگہ تخت پر بادشاہ کے بازو جا بیٹھی۔

لاکرینس اور اس کی نئی ملکہ کے درمیان بہت کم محبت تھی۔ اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ کارنیوس کی دختر نا قابل الفت تھی بلکہ جوں جوں اس کا شوہر اس سے زیادہ واقف ہوتا گیا۔ اس کی طرف سے اس کا دل پھرتا ہی گیا۔ وہ جبراً اس جگہ کو حاصل کرلینے کے بعد جس کے وہ قابل نہ تھی اور زیادہ مغرور بن گئی۔

اسپلٹ اس دوران میں کسان کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں اپنی زندگی کے ناخوشگوار دن کاٹتی رہی۔ وہ اپنے شوہر کی آمد کا بیتابی سے انتظار

کرتی تھی۔ اسے کھوئے ہوئے تخت سے زیادہ اپنی تبدیل شدہ قسمت اور اپنے شوہر کی جدائی کا رنج تھا۔ کاش وہ اس کو صرف ایک نظر دیکھ لینے میں کامیاب ہو جاتی! پھر وہ مرنے پر تیار تھی۔ تمام دن وہ ساحل پر تنہا بیٹھی رہتی اور ناپیدا کنار سمندر کو گھورتی۔ یا کبھی اونچے پہاڑوں کی پیلے راہ اور کٹھن چڑھائی طے کرکے ان کی چوٹی پر جا بیٹھتی اور شہر کی طرف دیکھتی رہتی۔ اس خیال سے کہ شاید وہ سمندر یا خشکی کے راستہ سے آرہا ہو۔ اور جب وہ تھکی ماندی جھونپڑی کو واپس ہوتی تو اسے گڈریے اور اس کی بیوی کی باتوں سے بہت کم تسلی حاصل ہوتی۔ جو اس قسم کی کہانیاں بیان کرتے جس میں کارنیوس کی قوت وعظمت کا ذکر ہوتا۔ یہ سنکر بیکس خاتون کانپ جاتی۔ اپنے شوہر کی سلامتی کا خیال کرتے ہوئے آدھی رات تک جاگتی رہتی روتی اور دعائیں کرتی کہ خدا اسے محفوظ رکھے۔

آخر کار ایک دن بادشاہ لاکرینس نے شکار کے بہانہ سے گوینڈولن سے اجازت حاصل کی۔ وہ اپنے شکاریوں کو دور چھوڑ کر تنہا کسان کی جھونپڑی میں آیا۔ اس غیر متوقع ملاقات سے دونوں کے مردہ دلوں میں پھر نئی جان پڑی۔ اور اسیلٹ کے سینہ میں زندگی کی وہ چنگاری جو بجھنے کے قریب تھی۔ ایک چمکدار شعلہ کی صورت میں پھر بھڑک اٹھی گویا بجھتی ہوئی شمع میں نیا تیل ڈالا گیا ہو۔ ان کی ہمتیں قوی ہو گئیں یہاں تک کہ وہ اس وقت کا۔ آپس میں ذکر کرنے لگے جب کہ ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور خدا جس سے سب کچھ ممکن ہے۔ گوینڈولن کے پنجہ سے لاکرینس کو چھٹکارا دلاکر ان کی پرانی کھوئی ہوئی خوشی کا کچھ حصہ ان کو واپس دلا دیگا۔ بادشاہ لاکرینس چونکہ اسیلٹ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اور گوینڈولن کے غصہ سے ڈرتا تھا کہ کہیں

اسے معلوم نہ ہو جائے کہ اسلیٹ زندہ ہے۔ اس لئے وہ ایک پوشیدہ تہ خانہ میں جو اس کے والد بروٹس نے عجیب و غریب اور پوشیدہ طریقوں سے بنایا تھا تاکہ اپنا خزانہ وہاں رکھے یا وقت ضرورت غنیم کی نظروں سے پوشیدہ ہو جائے، اسلیٹ کو رات کے وقت لے گیا۔ اور وہاں اسے مسلسل طویل اور المناک سات سال تک پوشیدہ رکھا۔ اسلیٹ کو وہاں جاکر زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ اس کے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ اس ننھی سی جان کی حفاظت کے خیال نے جو گویا قبر کی تاریکی میں نمودار ہوئی تھی اسے ہمت دلانے اور بری بھلی طرح اپنی زندگی کاٹنے پر مجبور کیا۔ سورج کی روشنی۔ دلفریب جنگل اور ٹھنڈی ہوا ایسی نعمتیں جو صرف سطح زمین پر رہنے والوں کے لئے مخصوص تھیں گو اس تک نہ پہونچ سکتی تھیں مگر ان سب کا نعم البدل اسے گوشت پوست کے ایک ننھے سے مجموعہ کی صورت میں مل گیا تھا چھوٹی صابرینا (اسلیٹ نے اپنی بیٹی کا یہی نام رکھا تھا) ان چیزوں کی آرزو مند نہ تھی۔ جن کو اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ گو شمع کی مدہم روشنی جو رات دن اس کے کمرہ میں جلا کرتی تھی۔ سورج کی قدرتی روشنی کی طرح اس کے گالوں کی سرخی اور لبوں کا تبسم بڑھا نہ سکتی تھی تاہم اس کا حسن دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اس کا دلچسپ کھیل یہ تھا کہ وہ ماں کے ہاتھوں کی حرکت کو تاکتی رہتی تھی۔ جب وہ چرخہ کاتتی رہتی تاگے گنتے ہوئے اور تعجب اور خوشی کے ساتھ اس کے نقش کو دیکھتے ہوئے جو اس کی صناع انگلیوں کی کوشش سے پیدا ہو جاتا۔ اسی طرح سات سال کے طویل عرصہ تک وہ اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک دوسرے کے ہمدم و غمگسار بنکر اسلیٹ بڑی بے چینی سے لاگر تیں

کے آنے کی منتظر رہتی۔ اور وہ بھی موقع پاتے ہی اسے دیکھنے چلا آتا
جب سات سال ختم ہوئے تو کارنوال سے خبر آئی کہ کاریتوس ایک
خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر آخر انتقال کر گیا۔ اس پر لاکرینس نے
فوراً ہی گوینڈولن کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا۔ جس کی درشت مزاجی
اور بے رحمی نے ان لوگوں پر جو اس کے اطراف تھے زندگی حرام
کر رکھی تھی۔ تاکہ مقید اسٹیلٹ کو رہائی دیکر دوبارہ تخت نشین کرے
جب گوینڈولن نے بادشاہ کے اس ارادہ کی اطلاع پائی اور معلوم
کر لیا کہ اسٹیلٹ زندہ موجود ہے۔ تو اس کا غصہ حد سے گذر گیا
مگر چونکہ لونگریا میں کسی کو اس سے ہمدردی یا محبت نہ تھی اور چونکہ
کارنوال دور اور اپنے بادشاہ کاریتوس کے انتقال کی وجہ خود بے
ترتیبی اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنے غصہ کو دبایا اور اپنے
ساتھ اپنے لڑکے ماڈوک کو لیکر اپنے ملک کارنوال کو واپس ہو گئی۔
اور رات دن انتقام لینے کے وسائل کی تلاش میں مصروف رہی۔
گوینڈولن کے جانے کے بعد لاکرینس بڑی شان و شوکت سے
شہزادی اسٹیلٹ کو شہر میں لایا اور ٹراٹونٹ کا محل ان کے قیام کے
لئے دیا اور اس پر سب پھر خوشی منانے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے
کہ زمین خزاں کے دور ہو جانے اور بہار کی آمد پر مناتی ہے۔ وہ لوگ
جو ملکہ کو قریب سے دیکھ لینے میں کامیاب ہوئے اس کے رنگ کی زردی
پر جس سے ان کا حسن دوبالا ہو رہا تھا متعجب اور خوش ہوئے۔ چھوٹی
شاہزادی حیران ایک ایک کا منہ تکتی ہوئی اپنی ماں کے بازو میں بیٹھی رہی
بالائی دنیا کی شان و شوکت چھوٹی شہزادی کو حیران کر دینے کے لئے
کافی سے زیادہ تھی۔ اس لئے خود کو روشنی اور شور سے دور چھپا لیا اور
اس تنہا اور ساکت کمرہ کے لئے تڑپنے لگی۔ جواب تک اس کا مسکن

رہاتھا۔ رنگارنگ کالباس۔ ہجوم کرتے ہوئے انسانی چہرے اور ان بے شمار خدمت گاروں کے عجیب و غریب مودبانہ اطوار جو دربار میں موجود تھے اسے پریشان اور مخوف کرنے لگے۔ وہ اپنی ماں کے پیچھے خاموش سایہ کی طرح متحرک تھی۔ طبیعت سست اور تھکی ماندی دکھائی دیتی۔ مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا۔ ان نئی چیزوں کا انوکھا پن غائب ہو گیا۔ اور وہ رفتہ رفتہ کھلی ہوا کو برداشت کرنے اور آخرکار اس سے محبت کرنے کے قابل بن گئی۔ مگر اب بھی اسے سایہ دار جنگل کے تاریک گوشے بہ نسبت رفیع الشان محلات کے اور خودرو زرد پھول اور نیلوفر بہ نسبت گل و لالہ کے زیادہ محظوظ کرتے تھے۔ اس سے ملنے والوں کو اس کی شیریں مزاجی نے بہت جلد مسحور کرلیا وہ اشتیاق سے ان آداب و فنون کو سیکھتی تھی جو اسے بتلائے جاتے تھے۔ اس لئے لوگ اس کے حسن و خوبصورتی کے ساتھ اس کے آداب و اخلاق کی بھی تعریف کرتے تھے۔ لیکن اس کے گال ہمیشہ کے لئے پھیکے اور بے رنگ باقی رہے۔ اور وہ تبسم جو اس کے لبوں پر ہمیشہ باقی پر چاندنی کے عکس کی طرح کھیلتا رہتا تھا کبھی شور قہقہہ سے نہ ٹوٹتا

جب اس حسین شہزادی کا شباب فتنہ زا آیا تو اس کے ماں باپ نے غور کرنا شروع کیا کہ ان طاقتور شاہزادوں میں سے جو اس کی خوبصورتی کا شہرہ سنکر دور دور سے اس کے دربار میں حاضر ہوئے تھے کس کے ساتھ اس کی شادی کیجائے کہ خود اس کی سلطنت کو بھی قوت پہنچے اتنے میں۔ یہ خبر لگی کہ گوینڈولن اور اس کا بیٹا ماڈک مشرق کی طرف کوچ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ لاکرینس کو قتل کر کے آسٹلیٹ اور اس کی بیٹی کو زندہ گرفتار کر لے جائیں گے۔

اس پر بادشاہ لاگرینس بھی چونکا اور اپنی فوجوں کو جمع کرکے دشمن کو روکنے کے ارادہ سے آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ اس کی ملکہ اور شہزادی بھی تھے۔ کیونکہ وہ ان کی حفاظت خود اپنی نظر کے سامنے رہنے میں سمجھا تھا۔ اور نہ وہ اسے تنہا ہی جانے دیتے تھے۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اطراف کے آثار بدشگونی کر رہے ہیں اور بادشاہ کا دل سینہ کے اندر غم سے بھاری ہو رہا ہے۔ کامبریا کی سرحد پر ایک بڑے دریا کے کنارے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور ایک خوفناک لڑائی ہوئی جس کے درمیان میں بادشاہ لاگرینس ایک تیر کا زخم لگنے سے قتل اور ہلاک ہو گیا۔ اور اسکیٹ اور اس کی بیٹی گرفتار ہو کر گوینڈولن کے ہاتھ میں جا پڑے۔

جب وہ کارینوس کی بیٹی کے سامنے پابزنجیر لائے گئے تو درشت طبیعت شہزادی بغیر نظر اٹھائے انہیں گھورتی رہی۔ رحم نے اس کے دل کو مس تک نہ کیا۔ بلکہ اس نے خوفناک اور غضب آلود الفاظ میں انہیں گالیاں دیں۔ مرحوم بادشاہ کے سر پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے۔ اس نے وحشیانہ طریقہ پر اپنی فتح پر اظہار مسرت کرنا شروع کیا۔ اسکیٹ نے اس کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ صرف وہ اپنی بچی کو سینہ سے چمٹائے رہی جو خوفزدہ اور خاموش اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ پھر گوینڈولن نے حکم دیا کہ دونوں کو رسی سے جکڑ کر اس دریا میں پھینک دیا جائے جو باز و بہہ رہا تھا۔ اس پر کارنوال کے رہنے والے جو خوفناک طاقت ور جنگجو جو دیوؤں کے نتیجے معلوم ہوتے تھے ان کو پکڑنے کے لئے جھپٹے۔ اب اسکیٹ نے اپنا سر اٹھایا اور گوینڈولن سے نظر ملا کر یوں کہا۔

بلکہ اگر میں نے تیری کوئی خطا کی تو خدا نے تجھے اس کا انتقام

بھی دلا دیا۔ میں نے بغیر کسی خواہش کے بے جانے بوجھے ایسا کیا۔ ہاں بے جانے بوجھے۔ تم نے جو سزا ہم کو دی ہے وہ یقیناً ترحمانہ ہے میں اس میں کسی قسم کی کمی یا تبدیلی نہیں چاہتی۔ یہ میری آرزو ہے کہ میں خدا کے پاس جا کر اپنے شوہر کے دیدار سے مشرف ہوں۔ مگر اس میں صرف اتنا اضافہ کر کہ تیرے خوفناک ڈاکوؤں کے ہاتھ اس عفت مآب شاہزادی کے بدن سے مس نہ ہوں۔ جو آخر تیرے شوہر کی بیٹی ہے۔ دیکھ ہم خوشی سے وہیں جاتے ہیں۔ جہاں کا تو نے حکم دیا ہے۔ خدا ہمارا استقبال کرے!"

یہ کہتے ہوئے وہ سبزہ زار پر سے گذر کر مٹیلے دریا کی طرف چلی۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے ہوئے اور جب وہ دریا کے کنارے پر پہونچیں اور سرگوشیاں کرتی ہوئی لہریں ان کے قدموں کو بوسہ دینے لگیں۔ ملکہ اسلیٹ نے اپنا منہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف پھیرا۔ خاموشی سے کچھ دعا کی اور اپنی بیٹی کو ہاتھوں میں لیکر دریا کے بیچ میں کود پڑی پھر کسی نے ان کو نہ دیکھا۔

مگر شاہزادی کا نام دریا کے ساتھ ہمیشہ ملا رہا۔ لوگ جو گلاسی سورن سے گذرتے ہیں کہتے ہیں کہ کبھی ایک جھلک اس حسین شاہزادی کی نظر آجاتی ہے۔ جو دریائی معبودوں کے عالیشان محلوں میں محوِ خواب ہے۔ تاکہ معصوم دلوں کی صدا پر اٹھے اور ان کی مدد کرے۔

دعوت کے بعد

(سر تھامس میالری - پندرھویں صدی عیسوی کا نصف آخر)

انگریزی علم ادب میں نثری روماں نگاری کے اس بانی اور مشہور مصنف کے حالات بالکل پردہ خفا میں ہیں - میالری کی ذاتی ترقی اور شہرت ہمارے لیے اتنی ضروری نہیں جتنی کہ اس کی قصہ نویسی ہے کیا کسٹن نے میالری کی ضخیم تصانیف دوسرے باب (۱۴۸۵ع) میں شایع کیں اور نو ایجاد طریق طباعت کی وجہ سے اس کی شہرت اس کے متقدمین سے زیادہ ہوئی ایڈمنڈ گوسن لکھتا ہے - میالری کردار نویسی کا ماہر ہے - اور وہی ابتدائی چشمہ ہے - جس سے ہم نے سنسنی کی تشنگی اور شجاعت کی محبت حاصل کی

موجودہ قصہ میالری کی تاریخ شاہ آرتھر و ملکہ ہولی گریل مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۶۸ سے محمد محی الدین صاحب تنویر قریشی نے اردو میں منتقل کیا ہے - اصل قصہ میں کوئی عنوان نہ تھا -

---(۱)---

ملکہ نے شہر لندن میں دعوت کا انتظام کیا جس میں راونڈ ٹیبل کے کل نائٹ مدعو تھے - ان کی فہرست نہایت طویل ہے - ہمارے قصہ کا

تعلق ان میں سے صرف چند سے ہے جن کے نام قصہ کے دوران میں خود بخود آتے جائینگے۔ یہاں اس کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ ہر قسم کے نفیس کھانے اور شربت مہیا کئے گئے تاکہ نائٹ جی بھر کر لطف اندوز ہو سکیں۔ سر آگاوین کی عادت تھی کہ وہ کھانے کے بعد میوے اور خصوصاً سیب و سنگترے کھایا کرتا چنانچہ جہاں اس کی دعوت ہوئی ان میووں کا بھی انتظام کیا جاتا ملکہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ سر آگاوین۔ تیز طبیعت اور گرم مزاج کا آدمی تھا اور سر پائنل کو اس سے نفرت و دشمنی تھی۔ اسی حسد و نفرت کی بنا پر سر پائنل نے چند سیبوں میں زہر ڈال دیا تاکہ وہ کھا کر مر جائے۔ مگر اتفاق سے ایک اور نائٹ سر پیاٹرس نامی نے ان میں سے ایک سیب کھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا جسم سوجنے لگا۔ حتیٰ کہ سوج کر پھٹ گیا۔ اور وہ فوراً مر گیا۔ سب نائٹ دم بخود رہ گئے اور غصہ کے مارے ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔ سب کا شبہ ملکہ کی جانب ہوا کیونکہ داعی وہی تھی سر گاوین نے کہا "ملکہ تم نے میری عادت جان کر میری خاطر میوے منگوائے۔ مگر ان میں زہر ملا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ میری ہی جان لینے کی تیاریاں تھیں"۔ ملکہ حیران پریشان ساکت کھڑی تھی۔ اس پر سر پیاٹرس کے ایک رشتہ کے بھائی سر ماڈار نے کھڑے ہو کر کہا "مجھے اپنے بھائی کا انتقام ملنا چاہیئے"۔ سب خاموش رہے۔ کیونکہ شک ملکہ پر تھا۔ جو رنج و خفت سے روتے روتے بیہوش ہو گئی۔ شور و پکار اور رونے کی آواز سن کر شاہ آرتھر اندر آیا۔ اور سر پیاٹرس کی موت پر بڑا تعجب اور افسوس ظاہر کیا۔

بادشاہ کے سامنے سر ماڈار نے بے باکی سے کھڑے ہو کر ملکہ پر زہر دینے کا الزام لگایا۔ شاہ آرتھر نے کہا "مجھے اس ناگہانی حادثہ کا سخت صدمہ ہے۔ مگر سر ماڈور۔ بہادر نائٹ! عجلت مت کرو۔ میں ایک

منصف بادشاہ کی طرح بے رو رعایت فیصلہ کروں گا۔ ابھی ملکہ پر الزام ثابت نہیں ہوا۔ اور نہ میرے خیال میں وہ اس جرم کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ جج ہونے کی حیثیت سے میں اپنی بیوی کی جانب سے لڑ کر اسے بے گناہ ثابت نہیں کر سکتا۔ تاہم تم کوئی دن امتحان اور مقابلہ کا مقرر کرو۔ تاکہ ملکہ کو اس الزام سے بری سمجھنے والوں میں سے کوئی بہادر نائیٹ کھڑا ہو کر تمہارے الزام کا جواب تلوار سے دے۔ اگر تم جیتے (کیونکہ فتح ہمیشہ حق کی ہوا کرتی ہے) تو ملکہ ملزم سمجھ کر زندہ جلا دی جائے گی۔ اور اگر ملکہ کا طرفدار جیتا تو دعویٰ خارج۔

"بادشاہ" سر ماڈارنے کہا "غصہ نہ کرو۔ گو تم بادشاہ ہو لیکن مرتبہ میں دراصل ہمارے جیسے ہی ایک نائٹ۔ تم نے بھی مظلوم کا بدلہ لینے کی قسم کھا کر تلوار کمر سے باندھی ہے۔ یہاں ان بیس نائیٹوں میں سے جو مدعو ہیں ایک بھی ایسا نہیں جو ملکہ کی صفائی کے لئے کھڑا ہو۔ کیونکہ سب کا شبہ ملکہ پر ہی ہے۔ کیوں دوستو ہے۔ اس نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا سب نے جواب دیا کہ یا تو یہ خود ملکہ کا کام ہے۔ یا اس کے اشارہ سے کسی نوکر کا۔

ملکہ نے کہا "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے کسی برے ارادہ سے دعوت نہیں دی۔ اور میں بے گناہ ہوں"۔ "امتحان کا دن مقرر کرو" سر ماڈارنے چلا کر کہا۔ "آج سے پورے دو ہفتہ بعد۔ ٹھیک پندرھویں روز۔ سر ماڈارا! تم مسلح اور سوار ہو کر دیسٹر کے سبزہ زار میں موجود رہو۔ اگر کوئی نائٹ ملکہ کی طرف سے آئے تو مقابلہ کرنا۔ خدا حق ہی کو ظفر دیتا ہے۔ ورنہ ملکہ ملزم جان کر آگ کے شعلوں کی نذر کی جائے گی"۔ بادشاہ نے جواب دیا

"میں تسلیم کرتا ہوں"۔ سر ماڈارنے کہا۔

سب مہمان رخصت ہو گئے اور بادشاہ نے خلوت میں ملکہ سے حقیقی ماجرا

دریافت کیا" میں بے گناہ ہوں۔ بالکل، اور زہر آلودہ سیبوں کی نسبت کچھ نہیں جانتی"۔ ملکہ نے جواب دیا۔

"سر لانسلاٹ کہاں ہے۔ اگر آج کے دن وہ یہاں ہوتا تو سر بادوڑ کو اتنا لاف وگذاف کرنے کی جرأت نہ ہوتی"۔"اُسے تو جلا وطن کر دیا گیا کس قصور کی پاداش میں؟" ملکہ نے پوچھا۔

تو پھر تم سر بارس کے پاس جاؤ اور اس سے تمہاری جانب سے لڑنے کی استدعا کرو۔ یقین ہے کہ نامنظور نہ کریگا۔ ان میں نائٹوں میں سے ہر ایک تمہارا مخالف ہے۔ کاش لانسلاٹ یہاں ہوتا۔ وہ پرستش کے قابل دوست ہے۔ مگر باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ جاؤ سر بارس کے پاس جلدی کرو"۔ بادشاہ نے مشورہ دیا۔

ملکہ نے سر بارس کے پاس ایک آدمی روانہ کیا۔ اور اس کو بلوایا۔ وہ آیا۔ مگر یہ خبر سن کے اس نے ملکہ کی ناانصافیوں کا گلہ کر کے کہا کہ ملکہ نے سر لانسلاٹ جیسے باوفا اور خیر اندیش نائٹ کو معمولی سے قصور کی سزا میں جلا وطن کر دیا۔ جو اس کا نہایت گہرا دوست تھا۔ اسی وجہ سے وہ ملکہ کی جانب سے لڑنے پر آمادہ نہیں۔ "کاش لانسلاٹ یہاں ہوتا اس نے کہا۔ وہ سچ اور جھوٹ دونوں صورتوں میں تمہارا ساتھ دیتا بغیر استدعا کیے ہوئے"۔

ملکہ دوزانو ہو کر التجا کرنے لگی۔ شاہ آرتھر بھی آگیا۔ اور سر بارس سے ملکہ کی حالت پر رحم کھانے کی التجا کرنے لگا "تم تسلیم کرتے ہو کہ سر لانسلاٹ ملکہ کا باوقار اور گہرا دوست تھا۔ اور کہ تم اس کے گہرے اور جان نثار دوست ہو دوست کا دوست دوست سے بڑھکر ہوتا ہے۔ تم اگر ملکہ کی خاطر نہیں تو کم از کم لانسلاٹ کی خاطر ملکہ کی جانب سے مقابلہ کرنا قبول کر لو"۔

سر بارس نے مجبور ہو کر قبول کر لیا۔ اور قول دیا کہ اگر اس وقت تک ملکہ کی

کی جانب سے لڑنے کے لئے کوئی اس سے زیادہ بہادر اور اس کام کے قابل دوست نہ آجائے تو وہ ملکہ کا ساتھ دیگا۔ ورنہ کسی اور طرفدار کے آجانے کے بعد وہ اس سے سبکدوش سمجھا جائے گا۔

ملکہ اور بادشاہ نہایت خوش ہوئے۔ اور سر بارس کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد سر بارس نے پوشیدہ طور پر اپنے دوست سر لانسلاٹ سے ملنے کا تہیہ کیا جو بجائے جلا وطن ہونے کے ایک راہب کی جھونپڑی میں چھپا بیٹھا تھا۔ یہ ایک گھنے اور تاریک جنگل کے درمیان واقع تھی سر لانسلاٹ نے جب تمام کیفیت سنی تو سر بارس کی عاقلانہ پیش بندی کی تعریف کی اور اسے ہدایت کی کہ وہ لوگوں میں یونہی مشہور کرے کہ وہ خود ملکہ کی جانب سے لڑنے والا ہے۔ مگر در اصل مقابلہ کے دن اس کا منتظر رہے۔

سر لانسلاٹ سے رخصت ہو کے سر بارس پھر لندن آگیا۔ اور ہمیشہ کی طرح دربار میں آنے جانے لگا۔ دوسرے نائٹوں نے تعجب سے پوچھا سر بارس کیا تم! ملکہ کی خاطر مقابلہ کرنے تیار ہو۔ سر بارس نے اثبات میں جواب دیا۔ بلکہ ان کو شرمندہ کرنا شروع کیا کہ بڑی افسوس کی بات ہے کہ تم ایسی پاک باطن اور رحمدل ملکہ پر اتہام لگا رہے ہو حالانکہ صنف نازک کی خدمت و عزت کی حفاظت کرنے کی قسم کھانے کے بعد تم نائٹ بنائے گئے۔

انھوں نے جواب دیا کہ وہ شاہ آرتھر پر دل و جان سے قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ مگر ملکہ پر نہیں۔ جس نے انھیں زہر دیکر قتل کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ زہر دینے والا ان کی نظر میں سوائے ملکہ کے کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس پر سر بارس نے جواب دیا کہ ان کا دعویٰ بالکل غلط ہے

ملکہ نے انہیں نیک ارادہ سے دعوت دی۔ نہ کہ بدنیتی سے - اور یہ کہ ان ہی میں سے کسی کا یہ فعل ہے جو کبھی نہ کبھی ظاہر ہو کے رہیگا۔ نائٹ اس سے ناراض ہو گئے۔

آخر کار چودہ دن گذر گئے۔ اور امتحان کے لئے صرف رات کا پردہ درمیان میں باقی تھا۔ ملکہ نے پھر سر بارس کو بلوا کر اس کا منشاء دریافت کیا اس نے اپنے پہلے الفاظ کو دہرایا کہ وہ بخوشی مقابلہ کرنے تیار ہے بشرطیکہ کوئی اس سے زیادہ اس کام کے قابل اور بہادر نائٹ ملکہ کی جانب سے لڑنے پر آمادہ نہ ہو۔ ملکہ نے شاہ آرتھر کو یہ خبر سنائی کیونکہ دوسرے کمرہ میں وہ بے چینی سے منتظر بیٹھا تھا۔

دوسرے دن جب سورج طلوع ہوا تو بادشاہ اور راؤنڈ ٹیبل کے کل نائٹ و نجیٹر کے سبزہ زار میں جمع ہوئے۔ بادشاہ کے آنے کے بعد ملکہ کو ملزم کی طرح ایک کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ جہاں سے تھوڑی دور پر ایک عظیم الشان الاؤ جل رہا تھا۔ تاکہ اگر الزام ثابت ہو جائے اور تقدیر ملکہ کے طرفدار کو شکست دے تو ملکہ نذر آتش کر دی جائے اس لئے کہ اس زمانہ میں انصاف کی نظر میں شاہ و گدا دونوں برابر تھے۔

سر ماڈار بادشاہ کے سامنے آیا۔ اور قسم کھا کر ملکہ پر الزام لگایا۔

سر بارس نے قسم کھا کر اس کی تردید کی۔

بادشاہ نے مباہلہ کا حکم دیا۔ اور دونوں تیار ہوئے۔ مگر سر بارس ہر کام میں سستی کرتا اور وقت کو ٹالتا رہا۔ سر ماڈار نے کئی مرتبہ توجہ دلائی۔ مگر سر بارس دیر ہی کرتا گیا۔ سر ماڈار نے جو میدان میں تلوار تولے کھڑا ہوا تھا غصہ میں آ کر ملکہ سے کہا۔

"بھیج تیرے بزدل نائٹ کو۔ تاکہ یا تو وہ تجھے الزام سے پاک

کرے یا حمایت کا مزہ چکھے"۔
اب تو سر بارس کو غصہ آیا۔ اور تلوار کھینچکر وہ بھی آگے بڑھا۔ دفعتاً ایک نقاب پوش جس کا سارا بدن اور گھوڑا آہنی زرہ میں ڈھکا ہوا تھا۔ جنگل سے نمودار ہوا۔ اور سیدھے سر بارس کے قریب آیا۔ سر بارس نے اسے ساتھ لے جاکر بادشاہ سے کہا کہ اس کی شرط اسی نائٹ سے متعلق تھی اور وہ اسی کا انتظار کرتے ہوئے وقت کو ٹال رہا تھا۔ اب بجائے اسکے یہ اجنبی نائٹ ملکہ کی خاطر سر ماڈار سے مقابلہ کریگا

"اس کا نام کیا ہے"؟ بادشاہ نے پوچھا۔

مگر سر بارس نے جواب دیا کہ اس نے اسکو پوشیدہ رکھنے کی قسم کھائی ہے پھر بادشاہ نے خود اجنبی نائٹ سے پوچھا کہ کیا وہ ملکہ کی طرف سے لڑنے تیار ہے۔

اجنبی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور ایک مختصر سی تقریر میں راؤنڈ ٹیبل کے نائٹوں پر ایسی رحمدل اور پاک طینت ملکہ پر الزام لگانے پر لعنت ملامت کی اور ان کی شجاعت پر طعنہ زنی کی۔

اس کے بعد اجنبی اور سر ماڈار مناسب تفاوت سے میدان میں کھڑے کردئے گئے۔ اور بادشاہ کے رومال گرانے پر دونوں برچھے تان کر ایک دوسرے کے سینے کو تاکتے ہوئے حملہ آور ہوئے سر ماڈور کا نیزہ ٹوٹ گیا اور وہ گھوڑے پر سے گر پڑا۔ اجنبی بھی شہسوار کی سی اور چابکدستی سے اتر گیا اور دونوں تلوار بکف لڑنے لگے۔

سر ماڈار مشہور شجیع تھا۔ مگر نقاب پوش اس موقعہ پر اس سے کچھ کم ثابت نہ ہوا۔ ایک گھنٹہ تک کشمکش جاری رہی۔ اور آخر کار سر ماڈار بے دم ہوکر زمین پر گر پڑا۔ نقاب پوش قریب گیا تاکہ دشمن کے سر سے خود اتار کر اپنی فتح منوالے۔ مگر سر ماڈار دفعتاً اٹھ بیٹھا

اور اپنا خنجر اجنبی کی پنڈلی میں گھونپ دیا۔ زخم تو کاری لگا۔ مگر اجنبی اسی طرح سیدھا کھڑا رہا۔ اور سر ماڈورکے کھڑے ہونے کے بعد اسے پھر زمین پر گرا دیا۔ اور سینہ پر چڑھ بیٹھا۔ مگر سر ماڈورڈ نے جان بخشی کی التجا کی۔ اجنبی نے اس شرط پر منظور کی کہ وہ ملکہ پر اپنے دعوے سے دست بردار ہو جائے۔ مقتول نائٹ کی قبر کے کتبہ پر زہر خورانی کا اندراج نہ کرے اور ملکہ کے قدموں پر گر کر معافی مانگے سر ماڈور نے خوشی سے قبول کیا اور اس کے ملازم اسے میدان مقابلہ سے اٹھا کر خیمہ میں لے گئے جہاں جراح بیٹھا تھا اجنبی بادشاہ کے تخت کے پاس گیا۔ جہاں ملکہ بھی کٹھڑے سے رہا کر دی گئی تھی۔

بادشاہ نے اجنبی کا شکریہ ادا کیا اور اسے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے وقت جب اجنبی نے اپنا خود اور نقاب آتاری تو سب نے تعجب کے ساتھ دیکھا کہ وہ سر لانسلاٹ کے سوا اور کوئی نہ تھا

بھوت

ڈانیل ڈیفو۔ (۱۶۵۹ تا ۱۷۳۱ء)

ڈانیل فو۔ جو ڈیفو مشہور ہے تقریباً ۱۶۵۹ء کو شہر لندن میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین فرقہ دسنٹرس کے پیرو اور مالی حیثیت سے اوسط طبقہ کے لوگ تھے۔ اس نے اپنی زندگی معاوضہ پر مضمون لکھنے پر بسر کی۔ سیاسی مضامین اور ہجویں کسی ایک زبردست پارٹی کی طرف سے ہو کر دوسری کو ذلیل کرنے کے لئے لکھتا رہا۔ نو سال تک ایک اخبار کی ادارت بھی کی اور ایک مرتبہ اپنی کسی سخت ترین ہجو کی وجہ سے جو فرقہ ڈسنٹرس پر کسی گئی تھی دو سال قید کی سزا پائی۔ اس کی تصنیفات بے شمار ہیں ساٹھ سال کی عمر کے بعد اس نے دو کتابیں لکھیں جو اس کی شہرت دوام کا باعث ہوئیں

ان میں سب سے پہلی رابن سن کروسو تھی جو دنیا کی پسندیدہ ترین کتابوں میں سے شمار کی جاتی ہے مگر اس سے چند سال قبل اس نے چند مختصر قصے بھی لکھے ان میں سے بہترین درج ذیل ہے جو حقیقت نگاری کی ایک اچھی مثال ہے ۱۷۰۶ء میں یہ قصہ ایک رسالہ کی صورت میں شایع اور پھر نظرثانی کے بعد بار دوم طبع کیا گیا۔

موجودہ قصہ سب سے آخری اشاعت کے ایک قصہ کا ترجمہ ہے جس میں ہجے اور رسم الخط کو موجودہ طرز پر تبدیل کر دیا گیا تھا اس قصہ کو محمد محی الدین صاحب [redacted] نے اردو کا جامہ پہنایا ہے

یہ حکایت اپنے واقعات کے لحاظ سے اس قدر عجیب اور واقعیت کے اعتبار سے اس قدر مصدقہ ہے کہ اس کی مثال ملنی بہت مشکل ہے۔ مسز بار گریو وہ خاتون ہے جسے مسز ویل کے انتقال کے بعد اس کا بھوت نظر آیا۔ پندرہ سولہ سال کی شناسائی کی وجہ سے میں مسز بار گریو کے اس بیان کی تصدیق کر سکتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں کہہ سکتی۔ مسز ویل اور مسز بار گریو میں بچپن سے گہری ملاقات تھی۔ مسز ویل ایک نیک مزاج خاتون تھی شگفتہ رو اور خوشدل۔ حتیٰ کہ اس کے شوہر کی سختیاں اس کی پیشانی کو شکن آلود نہ کر سکیں۔

مسز ویل ایک تیس سالہ خاتون تھی جسے چند سال قبل سے دوروں کی شکایت ہو گئی تھی دوروں کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھی۔ ان دوروں کی شناخت یہ تھی کہ وہ اپنی معمولی شگفتہ مزاجی اور نرم دلی کو چھوڑ کر کسی ایک بات پر اڑ جاتی اور ہٹ کرنے لگتی۔ وہ اپنے بھائی کے پاس ڈوور میں رہتی تھی اور بڑی پارسا اور عابدہ تھی۔ اور اس کا بھائی بھی کم از کم بظاہر ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ دونوں غریبانہ حالت میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنا پڑتا تھا

ان کا باپ ان کی طرف سے لاپرواہ تھا۔ اور مسنر بارگریو کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ گو اسے کھانا کپڑا حاصل کرنے کے لئے محنت کی ضرورت نہ پڑتی ۔ ایک ہی مذاق اور ایک ہی حالت زندگی کی وجہ سے دونوں کی دوستی ترقی کرتی گئی۔ مسنر ویل اکثر کہا کرتی " مسنر بارگریو خدارا کھے یہ کہ تم دنیا بھر میں میری بہترین اور واحد سہیلی ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ دنیا اور زندگی کا کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی اس رشتہ کو منقطع نہیں کر سکتا" وہ اکثر ایک دوسرے کے ساتھ رہتیں اور مصیبتوں میں ایک دوسرے کو تسلی دے لیا کرتیں ۔ ایک کتاب موت اور بعد الموت ۔ مصنفہ ڈریلین کورٹ اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتی ۔ غرض سچی عیسائی سہیلیوں کی طرح وہ ایک دوسرے کی ہمدرد و غمگسار تھیں۔

کچھ عرصہ بعد مسنر ویل کے ایک دوست نے اس کے واسطے ڈوورسکے دفتر کروڑگری میں ایک جائداد بہم پہونچائی اور یوں ان کی روزمرہ ملاقاتوں میں خلل پڑنے لگا۔ حالانکہ دونوں میں کوئی ناچاقی نہ تھی۔ حتیٰ کہ دونوں میں رفتہ رفتہ اجنبیت سی ہوگئی۔ اور ایک مرتبہ ڈھائی سال یونہی بغیر ملاقات کے گذر گئے۔ حالانکہ ملاقات کا کافی موقعہ انہیں حاصل تھا آٹھویں سیتمبر ۱۷۰۵ء کے روز دوپہر سے ذرا قبل مسنر بارگریو اپنے مکان واقع ڈوور میں بیٹھی ہوئی۔ اپنی بدقسمت زندگی پر تبصرہ کر رہی اور خود کو خدا کی رحم و مہربانی کے حوالہ کرکے قناعت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کہ دفعتاً کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سے وہ چونک پڑی اس نے اپنے کشیدہ کا کام پاس کی تپائی پر رکھدیا۔ اور دروازہ کھولنے دوڑی۔ اس نے تعجب سے دیکھا کہ مسنر ویل سواری کا لباس پہنے ہوئے وہاں کھڑی ہوئی ہے۔ اسی وقت گھڑیال نے بارہ بجائے۔ مسنر بارگریو ایک طویل عرصہ کے بعد اپنے سہیلی کو دیکھکر خوش بھی ہوئی اور متعجب بھی۔ وہ اسے اسی

کمرہ میں لے گئی جس میں وہ اس کے آنے کے قبل بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اسی آرام کرسی پر بٹھایا جس پر بیٹھکر وہ اپنی زندگی پر تبصرہ کر رہی تھی۔

"تنے دنوں بعد کیسے بھول پڑیں؟" مسز بارگریو نے پوچھا "میں سفر پر جا رہی ہوں۔ خیال آیا کہ جانے سے پہلے تم سے مل لوں" مسز ویل نے جواب دیا۔ "سفر پر تنہا؟ تمہارے بھائی نے اس کی اجازت کیسے دی؟" بھائی کو چکر دیکر میں تم سے ملنے چلی آئی۔ "پیاری سہیلی!" مسز ویل نے کہا۔ "میں اپنی بھولی ہوئی محبت اور ٹوٹی ہوئی یکجہتی کو پھر تازہ کرنے آئی ہوں۔ اور اس ڈھائی سال کی غیر حاضری کی معافی چاہتی ہوں مجھے امید ہے کہ تم ضرور معاف کر دوگی۔

"اس کا ذکر نہ کرو۔" مسز بارگریو نے کہا۔ "یہ میرا بھی تو قصور تھا جو تم سے ملنے آئی۔" "افسوس! اس حرکت کی وجہ سے تم نے میری نسبت کیا خیال کیا ہوگا،" مسز ویل نے پوچھا۔ "صاف کہدوں۔ تو میں سمجھی کہ تم بھی دنیا کی دوسری عورتوں کی طرح ہو جنہیں اگر روپیہ مل جائے تو دوست کو کیا خود کو بھی فراموش کر دیتے ہیں"۔

اس کے بعد گفتگو کا رخ گذشتہ باتوں کی طرف پلٹا۔ وہ ایک دوسرے پر کیسی مہربانیاں کرتی تھیں کیسی کیسی سیریں کیا کرتی تھیں۔ کونسی کتابیں پڑھتی تھیں اور خصوصاً ڈریلن کورٹ کی کتاب موت اور بعد الموت پڑھنے سے انہیں کیسی تسلی وتسکین حاصل ہوتی تھی۔

"جو اس موضوع پر لکھی ہوئی کتابوں میں بہترین ہے" مسز ویل نے کہا۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر شرلاک۔ اور اسی مضمون کی دو ڈچ کتابوں کا تذکرہ کیا جنکا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور ان کا مسٹر ڈریلن کورٹ کی کتاب الموت سے موازنہ کیا۔

"کیا یہ کتاب تمہارے پاس ہے؟" مسز ویل نے پوچھا۔ اور مسز بارگریو

کے سرہلانے پر اسے لانے کی فرمایش کی۔ وہ اسے لانے کے لیے دوسری منزل پر گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد لیکر آگئی۔

"پیاری مسز بار گریو"۔ مسز ویل نے کہا۔ "اگر ہماری اعتقادی آنکھیں بھی اسی طرح کھلی رہیں جس طرح کہ جسمانی تو ہم کو ہزاروں فرشتے نظر آئینگے جنہیں خدا نے ہماری حفاظت کے لئے مقرر کیا ہے۔ جنت کی کی نسبت ہمارے خیالات اصل حقیقت سے بہت دور ہیں اس لئے اطمینان رکھو۔ اور ڈرلین کورٹ کے قول کے مطابق یقین کرو کہ خدا تعالیٰ خاص طور پر تمہارا خیال کرتا ہے۔ اور یہ تکالیف خدا کی خاص مہربانی اور قرب کی نشانیاں ہیں۔ جو صرف تمہاری آزمایش اور امتحان کے لئے خدا کے حکم سے عارضی طور پر آئی ہیں۔ اور جب تم اس میں ثابت قدم نکلوگی تو خود بخود غائب ہو جائیں گی۔ سچ جانو کہ آئندہ خوشی کا صرف ایک لمحہ تمہاری گذشتہ مصیبتوں کی تلافی کر سکتا ہے (یہاں اس نے زور سے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ جس کی وہ دوران گفتگو میں عادی تھی) کیا تمہارا خیال ہے کہ خدا تمہیں ہمیشہ مصیبت میں مبتلا دیکھ کر خوش ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یقین مانو کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یا تو یہ تکلیفیں تم سے دور ہو جائیں گی۔ یا تم خود ان سے دور ہو جاؤ گی"۔

یہ تقریر اس نے ایسے درد بھرے روحانی لہجہ میں کی کہ مسز بار گریو کئی مرتبہ رو پڑی۔ اور اس پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا

پھر مسز ویل نے ڈاکٹر کینڈرک کی کتاب "اللہ والے" کا ذکر کیا اور قدیم عیسائی بزرگوں کی زندگی کے حالات کھول کھول بیان کئے "ہمیں ان کی ہر بات میں پیروی کرنی چاہیئے" اس نے کہا۔

پھر اشعار اور نظموں کا ذکر نکلا۔ مسز ویل نے کہا کہ مسٹر فورس کے پاس نظموں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ جس کا نام "کمال الفت" ہے کیا تم نے

اسے دیکھا ہے؟ مسٹر ویل نے پوچھا۔ تو لاؤ میں بھی دیکھوں"۔ مسٹر بارگریو
نے کتاب پیش کی مگر مسٹر ویل نے کہا۔ کہ آنکھیں جھکائے رکھنے سے اس
کے سر میں درد پیدا ہوتا ہے۔ لہذا مناسب یہ ہو گا کہ وہ خود پڑھ کر سنائے
جب وہ دوستی والی نظم پر پہنچی تو مسٹر ویل نے کہا "پیاری بارگریو
میں ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہوں گی" اس نظم میں دو مرتبہ السیان کا ذکر
آیا" "آہ" مسٹر ویل نے کہا شاعروں نے جنت کے کیسے کیسے نام رکھے
ہیں" مسٹر ویل نے کئی مرتبہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے مسٹر بارگریو
کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا دوروں کی بیماری کی وجہ سے میں
بد شکل ہو گئی ہوں" مگر مسٹر بارگریو نے نفی میں جواب دیا۔

اس کے بعد مسٹر ویل نے مسٹر بارگریو سے خواہش کی کہ وہ اس کے
بھائی کے نام ایک خط لکھے جس میں بتائے کہ وہ اپنی انگوٹھیاں فلاں
فلاں کو دینا چاہتی ہے۔ اور اس کے صندوق میں اشرفیوں سے بھری
ہوئی ایک تھیلی ہے جس میں سے دو اس کے بھانجے واٹسن کو دیدی
جائیں۔ مسٹر بارگریو نے اس کو خود لکھنے کے بار بار کہا
لیکن وہ۔ اتنی مصر ہوئی کہ مسٹر بارگریو کو شبہ پیدا ہونے لگا کہ کہیں پھر دورہ
ہونے لگا ہو اور اسی لئے اس نے ایک تپائی مسٹر ویل کے قدموں کے
نیچے رکھدی تاکہ وہ گر نہ پڑے اور خیال بٹانے کے لئے مسٹر ویل کے
ریشمی گون کا دامن ہاتھ میں لیکر اس کی سلائی کی تعریف کرنے لگی
مگر مسٹر ویل اپنی ہٹ پر اڑی رہی۔ مسٹر بارگریو مجبور ہو کر اٹھی کہ قلم دوات
لائے۔ مگر مسٹر ویل نے اسے یہ کہکر روک دیا کہ ابھی نہیں بلکہ اس کے
جانے کے بعد لکھے۔ مسٹر بارگریو نے وعدہ کر لیا۔

پھر مسٹر ویل نے مسٹر بارگریو کی بیٹی کی خیریت دریافت کی۔ مسٹر بارگریو
نے کہا کہ وہ گھر پر موجود نہیں۔ ہمسایہ کے پاس گئی ہوئی ہے۔ لیکن

اگر وہ اس سے ملنا ہی چاہتی ہے تو وہ اسے بلا لائے گی۔

مسز ویل نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن جب مسز بارگریو اپنی بیٹی کی ہمسایہ کے گھر سے ناکام تلاش کے بعد واپس آئی تو دیکھا کہ مسز ویل جانے کے لئے تیار کھڑی ہے۔ اور بڑی عجلت میں ہے ہر چند مسز بارگریو نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر مسز ویل اس سے یہ کہکر رخصت ہو گئی کہ وہ پیر کے روز سفر پر روانہ ہو گی۔ اور اسے امید ہے کہ اس سے قبل کسی روز مسز بارگریو واٹسن کے مکان پر اس سے ضرور ملنے آئیگی۔ یہ کہکر مسز ویل چلی گئی۔ اور ایک سڑک پر مسز بارگریو کی نظر سے غائب ہو گئی۔ اس وقت ٹھیک ایک بجکر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔

مسز ویل کا انتقال ساتویں ستمبر کو ٹھیک بارہ بجے دن کے ہوا۔ اس کے انتقال کے دوسرے روز جو اتوار کا دن تھا مسز بارگریو سردی اور زکام کے اچانک حملہ کی وجہ سے باہر نہ جا سکی۔ مگر پیر کے دن اس نے ملازمہ کو واٹسن کے گھر یہ دریافت کرنے بھیجا کہ مسز ویل ابھی وہیں ہے یا اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔

کپتان واٹسن کو اس دریافت پر بڑا تعجب ہوا۔ اور اس نے کہلا بھیجا کہ نہ مسز ویل وہاں ہے اور نہ آنے کی امید کی جا سکتی ہے مسز بارگریو نے خادمہ کو یہ کہکر ڈانٹا کہ وہ غلطی سے کسی دوسرے کے مکان پر دریافت کر آئی ہے۔ اور بیمار ہونے کے باوجود خود روانہ ہوئی۔ اور جب اسے وہاں مسز ویل کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی تو سخت تعجب ہوا۔

واٹسن کو مسز ویل کی مسز بارگریو سے ملاقات کا حال سنکر سخت حیرت ہوئی۔ اور تفصیل سے دوبارہ سننے کی غرض سے وہ دو آدمیوں کو لیکر

پھر مسٹر بارگریو کے گھر گیا۔ رفتہ رفتہ اس قصہ کی اتنی شہرت ہوئی کہ تیس تیس میل اطراف کے لوگ اسے مسٹر بارگریو کی زبان سے سننے کی غرض سے روز آنے لگے اس میں ایک مرتبہ اس قصہ کا مصنف بھی شامل تھا۔

مسٹر ویل نے افواہ کو دبانے کی بہت کوشش کی مگر وہ لاحاصل ثابت ہوئی وہ اسے جھوٹ ہی سمجھتا رہا۔ اس لئے بیان کیا کہ جب اس نے مسز ویل سے اس کے بستر مرگ پر پوچھا کہ کیا اس کی کوئی خواہش باقی ہے تو اس نے انکار کیا تھا۔ پھر وہ کیسے انگوٹھیوں کی تقسیم کی فرمایش کر سکتی ہے۔ دوسرے اشرفیوں کی تھیلی صندوق کے اندر سے نہ نکلی بلکہ میز کی دراز سے۔

مسز بارگریو کا بیان ہے کہ بہوت ویسا ہی تھا جیسا کہ آدمی ہوا کرتا ہے۔ جب اس نے ریشمی گون کو چھوا تو اس کے جسم سے اس کا ہاتھ لگا اور اسے گوشت کی نرمی محسوس ہوئی۔ اور جب مسز ویل نے اپنے زانوں پر ہاتھ مارا تو آواز برابر آئی۔

اب اس کا تصفیہ ناظرین پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ مسز بارگریو کا بیان صحیح ہے یا مسٹر ویل کا۔

علم اور دولت

جوزف ایڈیسن ۱۶۷۲ء تا ۱۷۱۹ء

ایڈیسن ویسٹ شائرمین ۱۶۷۲ء میں تولد ہوا۔ اس کے والدین باعزت اور تعلیم یافتہ تھے۔ جوزف ایڈیسن کی تعلیم کی ابتدا اکسفورڈ میں ہوئی اور وہیں اس نے لاطینی نظم سے ادبی دنیا میں قدم رکھا ۱۶۹۹ء میں اس نے سیاسی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے یورپ کا سفر کیا۔ لیکن ۱۷۰۲ء میں بادشاہ کے انتقال کی وجہ سے اسکی امیدیں منقطع ہوگئیں اور وہ وطن واپس آگیا دوسرے ہی دن اس نے ایک نظم جنگ کے عنوان سے لکھی جس میں بلینہم کی لڑائی اور مالبرو کی فتح کے واقعات اس خوبی سے بیان کیے رکھے کہ اس کی شہرت پھیلنے لگی اس نے اپنے رفیق اسٹیل کی مدد سے ایک اخبار ٹٹلر نامی جاری کیا جو بعد میں چلکر اسپکٹیٹر کے نام سے مشہور ہوا۔ اسپکٹیٹر کے مضامین اور افسانے انگریزی ادب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

محمد محی الدین صاحب نے اس قصہ کا اردو میں ترجمہ کیا۔

کل جب کہ میں اور میرا دوست سر روجر تفریحاً چہل قدمی کر رہے تھے ہمارے پاس سے ایک تازہ توانا سرخ رنگ نوجوان تیزی سے اپنے گھوڑے اور اس کے پیچھے دو نوکروں کو بھگاتا ہوا نکل گیا - میرے دریافت کرنے پر سر روجر نے کہا کہ یہ شریف نوجوان کافی جائداد کا مالک ہے - جس کی تعلیم و تربیت ایک ملائم طبیعت لاڈ پیار کرنے والی ماں کی زیر نگرانی ہوئی - اس کا مکان اس جگہ سے جہاں ہم کھڑے ہوئے ہیں کچھ زیادہ دور نہیں - میرے دوست نے یہ بھی بتلایا کہ وہ نیک خصلت خاتون اپنے لڑکے کی صحت کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتی ہے - جس کی وجہ سے اس کی تعلیم نامکمل رہ گئی - ماں کو یہ خیال تھا کہ پڑھنے سے بینائی میں فرق آتا ہے - اور لکھنے سے اس کے لڑکے کے سر میں درد پیدا ہوتا ہے - اس لئے اس نے پڑھنا لکھنا دونوں چھڑا دئے - جونہی وہ سوار ہونے کے قابل ہوا - اسے تفریحاً جنگل کی ہوا کھانے کی اجازت دیگئی اور شکار کھیلنے کی بھی اجازت مل گئی - مختصر یہ کہ میں نے اپنے دوست سر راجر کے بیان سے معلوم کیا کہ صحت تو اس نوجوان کی بہترین ہے مگر اس کے سوا باقی کچھ نہیں اگر انسان کا مقصود زندگی صرف زندہ رہنا اور عمدہ غذائیں کھا کھا کر موٹا ہونا ہے تو اس کے برابر عمدہ آدمی تمام ملک میں ڈھونڈے سے نہیں ملیگا -

واقعہ یہ ہے کہ جب سے میں اس حصہ ملک میں آیا ہوں میں نے ہزاروں واقعات ایسے نوجوانوں کے سنے - جو فی الحال تو ایک کوڑی کے بھی مالک نہیں - مگر آئندہ چلکر اپنے باپ کے مرنے کے بعد غیر محدود دولت اور عظیم الشان جائدادوں کے وارث ہیں - اور یا تو خود ابھی

دولت کو پیش نظر رکھکر یا دوست احباب اور نوکروں کے خوشامدانہ طور پر یقین دلانے سے یا ان کے اتالیقوں کے اسی بیوقوف خیالات کی وجہ سے دنیا میں اس کے سوا اور کسی کام کے قابل نہیں رہتے کہ عیش و عشرت سے اپنی زندگی بسر کریں اور والد کی پسینہ بہا کر پیدا کی ہوی دولت کو یا اپنی زندگی ہی میں اوڑا کر مفلس و قلاش بن جائیں یا تھوڑا بہت اپنے بیٹے پوتوں تک پہونچاویں -

اس پر مجھے دو دوستوں کا ایک واقعہ یاد آیا اسکو جو میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے تبدیل شدہ ناموں کے تحت لکھتا ہوں - گو اس کے عجیب و غریب واقعات ایسے بہ نسبت ایک صحیح واقعہ کے فسانہ بنا رہے ہیں - مگر مجھے امید ہے کہ اس کا ماحصل ضرور نتیجہ خیز اور مفید ہو گا -

بوڈاکس اور لیو نٹائن دو نوجوان جن کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا چھوٹی سی جائدادوں کے مالک تھے اور اسی پر کفایت شعارانہ طریقہ سے زندگی بسر کرتے تھے - دونوں کے دونوں عقلمند اور نیک طینت نوجوان تھے - ایک زمانہ میں دونوں ہم مدرسہ رہے تھے - اور بچپن ہی سے ان کے درمیان اس دوستی کی بناء پڑی جو آخر عمر تک برقرار رہی بوڈاکس نے اپنی تعلیم ختم کر کے دربار کا رخ کیا اور کچھ قدرتی قابلیت اور کچھ ذاتی محنت سے حاصل کردہ تعلیم کی وجہ سے ترقی پاتا گیا لیونٹائن جو شروع ہی سے علم کا دلدادہ تھا باوجود اس کے وہ اعلی تعلیم کے حصول میں مصروف رہا اور ساتھ ہی ساتھ مشہور لوگوں کی صحبت اور سفر سے بھی اپنے خیالات کو وسیع اور دماغ کو مجلا بناتا گیا وہ نہ صرف کئی علوم میں دخل رکھتا تھا - بلکہ ان علوم کے یوروپ بھر کے بڑے بڑے عالموں سے ملاقات بھی کی - گزٹ میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا عجیب نام گذرتا

جس سے اس نے کبھی گفتگو نہ کی یا کم از کم دیکھا نہ ہو۔ مختصر یہ کہ وہ کتابی معلومات اور انسانی تعلیمات کا انہماک سے گہرا مطالعہ کر کے ان میں ماہر اور یکتا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے زمانہ کا قابل ترین عالم شمار کیا جاتا تھا۔ اپنی تعلیم اور سفر کے دوران میں وہ یوڈاکس سے برابر مقررہ اوقات میں خط و کتابت کرتا رہا خطوط کے تازہ حالات اور نئی چیزوں سے یوڈاکس دربار کے بڑے بڑے آدمیوں میں مقبول بنا رہا۔ جب دونوں نے اپنی عمر کے چالیس سال ختم کئے (وہ عمر جب زندگی اور وقت کے تقاضے کھیلنے کی تمنا باقی نہیں رہتی) تو انھوں نے اپنے گذشتہ قول و قرار کے موافق اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر بقیہ عمر اپنے وطن میں آرام و اطمینان سے گذار دینے کا مصمم ارادہ کر لیا اس قصد سے دونوں نے بیک وقت شادیاں کر لیں اور لیوسٹائن نے اپنے دوست یوڈاکس کی لاکھوں کی جاگیر کے ہمسایہ میں اپنے اور اپنی بیوی کے مشترکہ سرمایہ سے تین سو سالانہ کی مختصر آمدنی کا ایک فارم خریدا۔ یہ رقم اس کے گذارہ کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔ اتفاقاً دونوں بیک وقت باپ بھی بنے۔ یوڈاکس کو لڑکا اور لیوسٹائن کو لڑکی پیدا ہوئی۔ مگر موخر الذکر کی بیوی جو اسکی مسرتوں کا مرکز اور تمناؤں کا واحد مقصد تھی انتقال کر گئی۔ لیوسٹائن کے حزن و ملال ایک شمہ بھی قلم سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کا دوست یوڈاکس روزانہ آکر کئی گھنٹے برابر اسے تسلی نہ دیتا اور اس کی ڈھارس نہ بندھاتا رہتا تو عجیب نہیں کہ اسی رنج میں وہ بھی مر جاتا۔ ایک روز جب کہ دونوں حسب معمول اسی قسم کی گفتگو کر رہے تھے کہ لیوسٹائن نے یہ سوچتے ہوئے کہ وہ اپنی لڑکی کو تعلیم دلوانے کے قابل نہیں ہے اور یوڈاکس سے اس بات کا شاکی ہوا کہ لڑکا جب کچھ دنوں بعد اس عظیم الشان جاگیر کے حال سے واقف ہو جائے گا جو اس کی ہونیوالی ہے

توپھر تعلیم وتربیت سے بے توجہی کر کے عیش وعشرت کی زندگی میں مشغول ہو جائیگا۔ دونوں اس فیصلہ پر پہونچے کہ بوڈاکس کا لڑکا لیونٹائن کے ساتھ اور لیونٹائن کی لڑکی بوڈاکس کے ساتھ سن شعور کو پہنچنے تک رہے۔ بوڈاکس کی بیوی جو یہ خیال کرتی تھی کہ لڑکے کی تعلیم صرف اس کے سامنے بہترین طریقہ پر ہو سکتی ہے۔ بڑی مشکل سے سے راضی ہوئی۔ آخر کار اس نے لیونتیلا (کیونکہ لڑکی کا یہی نام تھا) کو اپنی نگرانی میں لیا اور اسے اپنی بیٹی سمجھکر پرورش کرنے لگی۔ دونوں دوستوں کو ان بچوں سے جو صرف ان کے زیر پرورش تھے اسقدر محبت پیدا ہوئی کہ ہر ایک اپنے دل میں باپ سے بڑھکر محبت پانے لگا۔ حالانکہ وہ صرف نام کے باپ تھے۔ فلورنو۔ وہ نوجوان وارث جو لیونٹائن کے پاس رہتا تھا گو وہ لیونٹائن کے ساتھ محبت اور عزت کا برتاؤ کرتا مگر بوڈاکس کو دیکھنے پر جو روز آنہ آیا جایا کرتا غیر معمولی طور پر خوش ہوتا تھا۔ اور بوڈاکس بھی قدرتی محبت کی وجہ سے فلورنو کو چاہتا۔ لڑکا اب اتنی عمر کو پہونچ چکا تھا کہ وہ اپنے والد کی حالت زندگی کو سمجھتا اور جان سکتا تھا کہ بغیر اس کی ذاتی محنت کے باپ کے صرف تین سو سالانہ پر اس کا اور اس کے والد کا گذارا محال ہے یہ خیال روز بروز اس کے دل میں راسخ ہوتا گیا۔ اور اس کا اس پر نہایت عمدہ اثر پڑا۔ اس نے شوق اور محنت سے ان علوم کو سیکھنا شروع کیا جو لیونٹائن اسے پڑھاتا رہا۔ اس کی فطری قابلیتوں نے عدیم النظیر عالم کی زیر تربیت بہت جلد ترقی حاصل کی اور وہ تھوڑے عرصہ میں کئی علوم کا ماہر عالم بن گیا۔ اپنی عمر کے بیسویں برس کے قبل ہی اپنی تعلیم کو ختم کر دینے کے بعد اسے کالج سے نکال کر قانونی جماعت میں داخل کیا گیا۔ حالانکہ ان لوگوں میں سے بہت کم

پڑھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو یہ جانتے ہیں کہ بغیر پڑھے بھی انکی زندگی عیش و آرام میں بسر کرنے کے لئے ان کے والدین کے پاس کافی سرمایہ موجود ہے۔ مگر فلورنو کا یہ حال نہ تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تین سو سالانہ میں ایک آدمی کا گذارا ہونا مشکل ہے چہ جائیکہ دو ہواں اس لئے اس نے قانون میں غیر معمولی محنت شروع کی حتی کہ وہ اس کا ماہر بن گیا

میں ناظرین کو یہ بتانا بھول گیا کہ فلورنو میوٹائن کے پاس رہتا تو تھا۔ مگر لوڈاکس کے گھر میں بھی اس کی آمد و رفت رہی اور وہ وہاں نہایت ہر دلعزیز بنا ہوا تھا۔ اس کی ملاقات لڑکپن ہی میں لیونیلا سے ہو چکی تھی۔ اور یہ شناسائی رفتہ رفتہ محبت کی صورت میں بڑھتی گئی۔ جہاں اس کے دماغ میں علم و عمل کا چرچا تھا وہیں ایک کونے میں محبت کی شمع بھی روشن تھی۔ وطن سے دور رہنے کی حالت کو اگر وہ کسی وجہ نا پسند کرتا تھا تو وہ یہی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ وطن آنے کے لئے بیتاب و بے قرار رہتا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ غریب اور مفلس ہے اور لیونیلا وسیع جائداد کی تنہا وارث۔ اور یوں ذلیل ہو کر شادی کی درخواست کرنا اس کی اعلیٰ حوصلگی اور بلند خیالی سے بہت دور تھا۔ لیونیلا بھی اس کے ساتھ پوشیدہ طور پر محبت کرتی تھی۔ مگر اس طریقہ سے کہ خود فلورنو کو اب تک اس کا پتہ نہ چلا تھا۔ اب فلورنو فارغ التحصیل ہو گیا اور وکالت میں چند ہی دنوں میں وہ نام پیدا کیا کہ باید و شاید۔ اب بھی وہی جذبہ اس کے دل کے اندر کارفرما تھا۔ مگر پوشیدہ۔ دفعتاً اسے لیوٹائن کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ فوراً کام کاج چھوڑ کر گھر چلا آئے۔ کیونکہ بات یہ تھی کہ لوڈاکس اپنے بیٹے کی

فوری شہرت اور نیکنامی سننے سے اس قدر خوش اور متاثر ہوا کہ راز سربستہ کو کھولنے اور اپنے بیٹے کو گلے سے لگانے کا خیال اسے بےچین کئے دیتا تھا۔ جب فلورنو گھر پہونچا تو لیونٹائن یہ کہکر کہ وہ فوراً بوڈاکس کے گھر جائے۔ وہ اس سے کچھ اہم بات کہنا چاہتا ہے۔ اس کو اپنے گلے سے لگاکر پھوٹ پھوٹ رو دیا۔ فلورنو نے جو نہی اس عالیشان محل کے اندر قدم رکھا جو اس کے اپنے چھوٹے گھر کے ہمسایہ میں تھا تو بوڈاکس جو اس کا منتظر تھا۔ سلام و مصافحہ کے بعد اسے اپنے خاص کمرہ میں لیگیا جہاں اس نے حقیقت حال کا انکشاف کیا اور ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کی۔ "لیونٹائن کا شکریہ ادا کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں کہ میں تمہیں اس کی فرزندی میں دوں۔ جس کو یقیناً تم بھی پسند کرو تاکہ اس کی بیٹی جواب تک میری بنی رہی۔ اور اس وسیع جائداد کی مالک کہلاتی رہی۔ اب بھی ویسی ہی رہے۔ جس کی وہ درحقیقت قابل بھی ہے۔ اور تم بھی لیونٹائن سے جدا نہ ہو۔ اب تم اس وسیع جائداد کے مالک بننے سے خوش ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ اس کا انتظام بھی تمہارے ہاتھوں میں ٹھیک ہوگا۔ لیکن اگر تمہیں شروع ہی سے اس کی امید رہتی تو آج تک تم اسے اڑا چکے ہوتے۔ تمہاری ماں بازو کے کمرہ میں تمہیں گلے لگانے کے لئے بیتاب کھڑی ہے۔ جاؤ اس سے ملو اور خود کو اس رتبہ کے قابل ثابت کرو لیونیلا بھی یہی الفاظ اس وقت تمہاری والدہ کی زبانی سن رہی ہوگی۔" فلورنو فرط مسرت سے شادی مرگ کے قریب ہوگیا۔ اس کی زبان سے الفاظ نہ نکل سکے وہ باپ کے قدموں پر گر پڑا اور اس کے ہاتھوں کو انداز تشکر سے بوسے دینے لگا۔ اب صرف یہ کہنا باقی ہے کہ لیونیلا۔ اور فلورنو دونوں کی شادی ہوگئی اور دونوں نے اپنی عجیب و غریب طریقہ پر مکمل تعلیم و تربیت حاصل کر کے والدین کا

لنگڑا سپاہی

الیور گولڈاسمتھ ۱۷۲۸ء تا ۱۷۷۴ء

گولڈاسمتھ انگریزی خاندان کے آئرش والدین کا فرزند ہے۔ اس کا متقام پیدائش کاونٹی لانگفورڈ آئرلینڈ ہے۔ اس نے اپنی تعلیم کی ابتدا ٹرنٹی کالج ڈبلن سے کی جہاں سے ۱۷۴۹ء میں بی۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد اس نے طب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ کچھ بعد وہ یورپ کی سیر کے لئے نکلا جہاں وہ ملک بہ ملک پھرتا رہا۔ لندن واپس آنے کے بعد اس کے مضامین اور اشعار ڈاکٹر جانسن کے لئے جاذب توجہ ثابت ہوئے۔ اور وہ انکے ادبی حلقہ کا ایک رکن بن گیا اس کی کل ادبی زندگی میں ۱۷۵۹ء تا ۱۷۷۴ء کا زمانہ نہایت زرخیز گذرا ہے۔ وکار اف ویکفیلڈ نامی ناول جو افسانوی ارتقار کا بام عروج سمجھا جاتا ہے ۱۷۶۶ء میں شایع ہوئی۔ اپنے ہمعصروں اسٹیل اور ایڈیسن کی طرح اس نے چند افسانے بہترین قسم کے لکھے۔

محمد محی الدین صاحب نے اس قصہ کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔

کوئی مشاہدہ اس سے زیادہ عجیب عام اور صحیح نہیں جتنا یہ کہ دنیا کا نصف حصہ دوسرے نصف حصہ کی زندگی کے حالات سے قطعاً ناواقف ہے۔ بڑے آدمیوں کی ذرا ذرا سی تکلیفیں۔ موٹی موٹی سرخیوں کے تحت ایسی رنگ آمیزیوں سے بیان کی جاتی ہیں کہ خواہ مخواہ دل میں ہمدردی کا طوفان جوش مارنے لگتا ہے۔ اخباروں کے کالم کے کالم واقعہ گذرنے کے ایک عرصہ بعد تک اسی کے ماتم میں سیاہ

ہوتے رہتے ہیں۔ اور خود بڑے آدمی جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو کم از کم اس خیال سے ان کو کچھ نہ کچھ تسکین و تسلی ضرور حاصل ہو جاتی ہے کہ ساری دنیا کی طرف متوجہ ہے اور اس کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے۔

اس حالت میں جب کہ ساری دنیا کی نظریں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں اور تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری ذرا سی لغزش پر ہمیشہ کے لئے بزدلی کا خطاب اور جگ ہنسائی کی لعنت عمر بھر کے لئے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی تو مصیبت کو صبر سے اٹھانا کوئی کمال کی بات نہیں۔ اول تو اس کے ڈر سے تم خود سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ گے اور دوسرے دنیا کے لائق ترین دماغ ہر قسم کے مشورہ کے ساتھ تمہاری مدد کے لئے تیار رہیں گے۔ نہ صرف مشورہ ہی۔ بلکہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے روپیہ سے بھی۔ یہاں فخر خودپسندی کا خیال بھی تمہاری بہادری کے ساتھ ملا ہوا ہوگا۔ لیکن وہ بیکس جس کو دنیا بھر میں کسی ایک آدمی کی بھی ہمدردی کا سہارا نہیں۔ نہ کوئی اس کی حرکات کا نگران ہے اور نہ کوئی اسے ہمت دلانے اور تسلی دینے والا ہے اگر ان مصیبتوں کو دلیرانہ خندہ پیشانی سے برداشت کر لے تو یقیناً قابل صد تحسین ہے۔ وہ قابل تعظیم ہستی ہے اور اس لائق ہے کہ لوگ اس کی مثال ہمیشہ پیش نظر رکھ کر پیروی کی کوشش کریں۔

اس قدر ناشناس دنیا میں دولت مندوں کے ناخن کو اگر ٹھیس لگ جائے تو دنیا بھر کے مصوران غم اپنی دردناک ناولوں کا انہیں ہیرو بنا دیں گے۔ اور اپنی پوری فصاحت و بلاغت اس میں صرف کر دیں گے کہ کسی طرح مبالغہ میں وہ ایک دوسرے سے پیچھے نہ رہیں۔ حالانکہ غریب اور وہ غریب جن کی مصیبتیں درحقیقت مصیبتیں

بلکہ قیامتیں ہوتی ہیں ۔ بالکل نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔ یہی گمنام دن بھر میں جتنی آفتوں کا سامنا کرتے ہیں۔ شاید امیروں کو عمر بھر میں ان کے نام بھی معلوم نہ ہو سکتے ہونگے معمولی سا سپاہی ۔ تنہا بغیر ایک لفظ شکایت کا زبان سے نکالے موت کے منھ میں پھاند جاتا ہے ۔ اگر بچ نکلا تو فرض ادا کیا ۔ شاباش“ اور اگر مر گیا تو بیوہ کو تا حین حیات پانچ روپیہ وظیفہ“ اور اگر بجائے اس کے کرنل صاحب کے خیمہ کے ایک سو گز کے فاصلہ کے اندر کوئی بم کا گولہ گرے ۔ تو کرنل صاحب کو تو خبر بھی نہ ہو۔ مگر اخباروں میں پڑھیئے بال بال بچ گئے فیلڈ مارشل...... کو اڑانے کی خطرناک سازش“ لیجئے اب تو اپنی ہی فوج کے دو چار آدمی دشمن کے جاسوس سمجھ کر پکڑے گئے ۔ بلکہ قتل بھی کر دئے گئے ۔

میں کس قدر غصہ و نفرت کے ساتھ ایک آہ بد ۔ سرد۔ بار آور ن کو اپنی بد قسمتی کا گلہ کرتے سنتا ہوں۔ حالانکہ ان کی بڑی سے بڑی آفت صرف یہی تھی کہ کرہ زمین کے اس چھوٹے سے خطہ تک وہ نہ پہونچ سکے ۔ جس پر انھوں نے اپنی بیوقوفی سے اپنی مسرت اور آرزو کا انحصار کر رکھا تھا اور جس کے لئے وہ انسانوں کا خون بھلاتے ہیں ، اور قیمتی جانیں قربان کر ڈالتے ہیں ۔ ان کی غیر محدود دولت ان کی زندگی عیش و عشرت میں گذار دینے کی کافی طور پر ضامن ہوتی ہے ۔ حالانکہ مفلس ۔ اسی نوع انسانی کا ایک فرد ۔ بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ اور موسموں کی دست درازی سے بچنے تک کا اسے سہارا نہیں ہوتا۔

یہ خیالات میرے دماغ میں ایک غریب آدمی کی ملاقات کی نہ بخذہ یاد سے چکر لگا رہے تھے ۔ جس سے میں چند روز قبل ملا تھا۔ اس کو میں

بچپن سے جانتا تھا۔ وہ جہازیوں کے کوٹ میں ملبوس۔ لکڑی کے پاؤں کا سہارا لئے ہوئے شہر کے ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا میں جانتا تھا کہ وہ ایک محنتی اور ایمان دار آدمی ہے۔ مجھے سخت تعجب ہوا۔ میرے دل میں اس کا سبب جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جس کا اس پر اظہار میں نے اس وقت جو مناسب نظر آیا اسے دینے کے بعد کیا۔ اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ میں چند چاندی کے سکوں کو خوشی سے دیکھنے کے بعد وہ میری صورت تکنے لگا۔ اور کچھ وقفہ کے بعد سر کھجاتے ہوئے پشیمان ہو کر اور اپنی لکڑی کا سہارا لیکر اس انداز سے کھڑا ہوا کہ میرے دل میں رحم کا دریا ابل پڑا اس نے کہنا شروع کیا۔

"جناب عالی! میں یہ جھوٹ کہکر اپنی زبان آلودہ کرنا نہیں چاہتا کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدقسمت ہوں۔ کیونکہ میرا ایک پیر کٹ جانے کی وجہ سے میں بھیک مانگنے پر مجبور ہوا ہوں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ مجھے کوئی وجہ شکایت نظر نہیں آتی۔ میری ہی رجمنٹ کا ایک اور شخص ہے جس کی دونوں ٹانگیں کٹی ہوئی ہیں اور ایک آنکھ بھی پھوٹی ہوئی ہے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری حالت اس سے بہتر ہے۔

میں شراپ شایر میں پیدا ہوا۔ میرا باپ ایک معمولی مزدور تھا میری عمر کے پانچویں سال اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے یتیم خانہ میں داخل کرایا گیا۔ مگر چونکہ میرا باپ سیاحت کا شوقین تھا۔ اور کسی ایک گاؤں میں قیام نہ کرتا تھا۔ اس لئے ہر گاؤں کے یتیم خانہ کا مہتمم مجھے اپنے علاقہ سے خارج سمجھکر دوسری جگہ بھیجدیتا۔ وہ اتنے عرصہ تک مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہے

کہ مجھے خیال پیدا ہونے لگا کہ میرا مقام پیدائش عالم وجود میں نہیں
اور میں بے وطن ہوں۔ اس الٹ پھیر سے تنگ آرہا تھا کہ ایک
خیرات خانے کے منتظم نے مجھے قبول کر لیا۔ اور میں پرورش پانے لگا
میں بچپن سے پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ راغب تھا اور عالم
بننا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے اس کا موقعہ نہ ملا۔ اور جونہی میں ہل
جوتنے کے قابل ہوا مجھے ایک کاشتکار کی نگرانی میں دیدیا گیا
یہاں میں نے اپنی زندگی کے پانچ برس آرام سے گذارے۔ میں
دن بھر میں صرف دس گھنٹہ کام کرتا۔ اور باقی وقت چار دیواری
کے اندر ہی اندر کھیلنے کودنے میں صرف کرتا کھانیکو مجھے پیٹ بھر
ملا کرتا۔ اور میں اپنے کام کو خوب پسند کرتا تھا۔ اسی لئے میں
دلدہی سے محنت کرتا تھا۔ حتیٰ کہ میرے آقا کا انتقال ہو گیا
اور میں خود اپنی روزی کمانے پر مجبور ہو گیا۔ اور باہر دنیا میں
قدم رکھنے کا عزم مستقل کر لیا۔

اسی طریقہ سے کئی شہر بہ شہر پھرتا رہا۔ جہاں کام ملا کر لیا۔ ورنہ
بھوکے رہنے کی عادت ہونے سے ایک آدہ دن کھانا نہ ملنا کچھ
زیادہ تکلیف دہ بھی نہ معلوم ہوتا تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ میں کسی
کھیت پر سے گذرا جو ایک منصف عدالت کا تھا۔ میرے سامنے سے
ایک خرگوش نکلا۔ میں اسے پتھر سے زخمی کر کے پکڑ رہا تھا کہ خود مجسٹریٹ
صاحب آگئے۔ انھوں نے مجھے چور اور بدمعاش کہا۔ اور میرا گلا
گھونٹتے ہوئے مجھے اپنا حال بیان کرنے کا حکم دیا۔ میں ان کے
سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا اور مفصل حال کہنا شروع کیا
آخر میں التجا کے انداز سے اپنی لاعلمی سے شکار کرنے پر آنسو بہاتے
ہوئے ان سے معافی مانگی۔ مگر منصف صاحب مجھے سر و رع ہی سے

جھٹلاتے رہے۔ اور آخر کار میرا چالان کر دیا۔ میں عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں مجھ پر آوارہ گردی اور چوری کا الزام لگایا اور مجھے عارضی طور پر نیوگیٹ کے قید خانہ میں بھیجدیا گیا۔ تاکہ مجھے جلاوطن کر دیا جائے۔

اخباروں میں آئے دن جیل خانہ کی بدانتظامیوں اور خرابیوں کا رونا رویا جاتا ہے۔ مگر میرے لئے وہ بڑا آرام دہ اور عمدہ مقام تھا۔ مجھے کچھ کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ اور کھانا پیٹ بھر ملتا۔ ایسی خوشگوار زندگی ہمیشہ بسر نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے پانچ ماہ بعد مجھے جیل خانہ سے نکال اس جہاز پر سوار کرا دیا گیا۔ جو جلاوطنوں کو نوآبادیات کی طرف لے جایا کرتا تھا۔ یہ سفر البتہ بری طرح کٹا۔ حفاظت کے خیال سے تنگ اور بند جگہ میں سب کے سب یکدم بھر دئے گئے جسکی وجہ سے ہم میں سے ایک سو کا تو راستہ ہی میں انتقال ہو گیا۔ اور باقی جو بچے وہ بھی اس قدر مریض و ناتوان تھے کہ کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔ خیر کسی طرح ہمیں ساحل پر اتارا گیا۔ اور بڑے بڑے کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ میری میعاد سات سال کی تھی۔ لکھنا پڑھنا۔ میں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس لئے مجھے حبشیوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ میں نے وفاداری کے ساتھ پورے سات سال وہیں گذار دیئے مدت ختم ہو جانے کے بعد بھی میں نے کچھ دنوں تک اجرت پر کام کیا۔ تاکہ پیارے وطن انگلستان کو واپس ہونے کے لئے جہاز کا کرایہ حاصل کر سکوں۔ کیونکہ مجھے وطن سے محبت تھی۔ اور میرا دل اسے دیکھنے کے لئے بیقرار تھا۔ مجھے خوف تھا کہ مجھے وہ ایک مرتبہ آوارہ گردی اور بدچلنی کے الزام میں گرفتار نہ کر لیا گیا

اس لئے میں نے گاؤں کا رخ ہی نہ کیا۔ بلکہ شہر کے اطراف پھرتا رہا۔ اور مختلف چھوٹے چھوٹے کام مزدوری پر کر کے اپنا پیٹ پالتا رہا۔

میں اس طرز زندگی سے خوش اور اس پر قانع تھا۔ حتیٰ کہ ایک رات جب کہ میں کام کر کے واپس ہو رہا تھا ایک گلی میں دو آدمی مجھ سے ٹکرا رہے میں اس دن کی اجرت کے چند آنوں کو کفایت شعارانہ طریقہ پر خرچ کرنے کی تجاویز سوچتا آرہا تھا۔ کہ دفعتاً ٹکر لگی۔ اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا انھوں نے مجھے اٹھنے کا حکم دیا میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ چند معزز آدمی تھے۔ اس لئے مجھے پھر عدالت میں گرفتار کر کے حاضر کیا گیا۔ اور اپنی طرز زندگی اور کسب معاش کا قابل اطمینان حال نہ بتلا سکنے کے الزام میں مجھے حکم دیا گیا کہ میں سپاہیوں میں بھرتی ہو جاؤں۔ یا تو بحری فوج میں یا بری میں نے موخر الذکر پسند کیا۔ اور اس شریف عہدہ پر رہکر دو لڑائیوں میں حصہ لیا فلنڈرس میں ایک تو وال اور دوسرے فان ٹن آئے پر۔ مجھے صرف ایک زخم۔ یہاں سینہ پہ لگا۔ مگر رجمنٹ کے ڈاکٹر نے مجھے پھر تندرست کر دیا۔

جب صلح ہوئی تو مجھے برطرف کر دیا گیا۔ اور چونکہ میں زخم کے بعض وقت تکلیف دہ ہونے کی وجہ سے زیادہ کام نہ کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے میں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر میں ملازمت کی درخواست دی۔ سپاہی بنکر میں ہندوستان آیا۔ اور یہاں چھ لڑائیوں میں شرکت کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں لکھنا پڑھنا جانتا تو کپتان مجھے کم از کم ایک درجہ کی ترقی دیتا۔ مگر یہ صرف اپنا تصور تھا۔ دفعتاً مجھ پر بیماری کا حملہ ہوا اور مجھے وطن جانے

کی اجازت چالیس پونڈ انعام کے ساتھ دی گئی۔ یہ حالیہ جنگ کے اوائل کا واقعہ ہے۔ میں ساحلِ انگلستان پہونچ کر ان چالیس پونڈوں سے کوئی منفعت بخش کام کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ سرکار کو سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ اور جہاز پر میری صحت بحال ہو چکی تھی۔ اس لئے مجھے مجبور کر کے جہازیوں میں ملازم کر لیا گیا۔ میں نے ابھی ساحل پر قدم بھی نہ رکھا تھا کہ ملازمت کے سلسلہ میں مجھے سمندر ہی پر رہنا پڑا۔

اس افسر نے جو میرے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ مجھے گستاخ اور کام چور پایا۔ وہ قسم کھاتا تھا کہ میں کام کرنا جانتا ہوں مگر جی لگا کر کام نہیں کرتا۔ مگر خدا جانتا ہے کہ میں جہازی کاروبار سے قطعاً ناواقف تھا۔ وہ اسی الزام پر مجھے اکثر مارتا بھی تھا۔ مگر ابھی میری جیب میں چالیس پونڈ جوں کے توں موجود تھے۔ اور جیب میں روپیہ کا رہنا بڑا تسلی بخش ہوتا ہے۔ وہ روپیہ میرے پاس اب تک باقی رہتا۔ مگر ہمارے جہاز کو فرانسیسوں نے گرفتار کر لیا اور مجھ سے کل روپیہ چھین لیا گیا۔

ہم کو قید کر کے برسٹ پہونچایا گیا۔ ہم میں اکثر مر گئے۔ کیونکہ وہ قید خانہ میں رہنے کے عادی نہ تھے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے وہ میرے لئے اتنا مصیبت دہ نہ تھا۔ کیونکہ مجھے ایک مرتبہ کا تجربہ حاصل تھا۔ ایک رات جب میں بلانکٹ اوڑھے ہوئے ایک لکڑی کے تختہ پر سو رہا تھا۔ اسی جہازی افسر نے جو میرے کام کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ مجھے جگایا۔ اس کے ہاتھ میں اندھیری قندیل روشن تھی۔ "جیک" اس نے مجھ سے کہا۔ کیا تم اس فرانسیسی سنتری کو مار ڈالنے پر تیار ہو؟" "میں چلے گئے رہنے کی

کوشش کرتے ہوئے کہا" میں آپ کی مدد کو تیار ہوں"۔

"میرے پیچھے آؤ۔ دبے پاؤں"۔ اس نے کہا۔"مجھے امید ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے"۔

میں اٹھا۔ اور بلانکٹ اٹھا کر کمر سے لپیٹ لی۔ کیونکہ میری ساری کائینات صرف یہی تھی۔ اور اس کے پیچھے دبے پاؤں چلا۔ میں فرانسیسیوں سے خاص طور پر نفرت رکھتا ہوں اور غالباً یہ بات میری فطرت میں داخل ہو گئی ہے۔

ہمارے پاس ہتیار نہ تھے۔ مگر ایک انگریز پانچ فرانسیسیوں پر بھاری ہوتا ہے۔ گو وہ تنہا ہی کیوں نہ ہو۔ ہم دروازہ تک گئے جہاں دو سنتری کھڑے ہوئے تھے۔ ان پر اچانک حملہ کر کے ایک لمحہ میں ان کے ہتیار چھین لئے اور ان کو بے ہوش کر دیا وہاں سے ہم میں سے صرف نو آدمی بھاگ نکلے اور جو کشتی سب سے قبل نظر آئی اس پر سوار ہو کر خود کو سمندر اور خدا کے حوالہ کر دیا کشتی میں ابھی پورے تین دن بھی نہ گذرے تھے کہ ڈورسٹ کے ایک تجارتی جہاز نے ہمیں دیکھکر سوار کرا لیا اور ساتھ ہی ساتھ اتنے کارگزار آدمیوں کے یکایک مل جانے سے خوش ہو کر نوکر بھی رکھ لیا۔ مگر بدنصیبی نے یہاں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور تیسرے یا چوتھے روز ہمارا مقابلہ ایک چالیس توپوں والے جہاز سے ہوا۔ ہمارے پاس صرف تیس توپیں تھیں تین گھنٹے تک معرکہ کی لڑائی ہوتی رہی۔ اگر چند آدمی بھی ہمارے پاس اور ہوتے تو ہماری فتح یقینی تھی مگر بدقسمتی سے ہم فتح کے قریب تھے کہ ہمارے یہاں سے زیادہ آدمی کچھ تو مقتول اور کچھ زخم لگنے کی وجہ سے بیکار ہو گئے۔

میں پھر ایک مرتبہ فرانسیسوں کے پنجہ میں گرفتار ہو گیا۔ اور یقین ہے کہ اگر مجھے برسٹ لے جاتے تو مجھے سخت ترین سزا ملتی مگر خوش قسمتی سے۔ والٹر نامی انگریزی جہاز نے فرانسیسوں سے مقابلہ کر کے ہمیں چھڑا لیا۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس لڑائی میں مجھے دو زخم اور لگے۔ بائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کٹ گئیں اور میرا پیر اڑ گیا اگر خوش قسمتی سے یہی زخم مجھے کسی سرکاری جہاز کی ملازمت میں لگتا تو عمر بھر کے لئے وظیفہ ہو جاتا۔ مگر اتفاق سے ایسا نہ ہوا۔ ہر شخص اپنے منھ میں چاندی کا چمچہ لئے ہوئے پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال خدا کا شکر ہے کہ میری صحت اچھی ہے اور کھانا بھی تین وقت اگر نہیں تو دو وقت تو ضرور مل جاتا ہے۔ اب دل میں یہی آرزو باقی ہے کہ جبتک جیتا رہوں آزادی اور اپنے پیارے وطن انگلستان کا دم بھرتا رہوں — ہمیشہ کے لئے آزادی پائندہ باد۔ انگلستان زندہ باد۔

یہ کہتے ہوئے وہ لنگڑاتا ہوا چلا گیا اور اپنی بے نظیر شجاعت اور عدیم المثال صبر و استقلال سے میرے دل میں جذبات تعظیم و تکریم چھوڑ گیا۔ اور اب میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایسی کوئی اتفاقیہ ملاقات بہ نسبت فلسفہ کے جو دنیا سے نفرت کا سبق سکھاتا ہے بہت زیادہ کام کر جاتی ہے۔

نکاح بالجبر

سر والٹر اسکاٹ ۱۷۷۱ء تا ۱۸۳۲ عیسوی

سر والٹر سکاٹ تاریخی رومان نگاری کا موجد خیال کیا جاتا ہے۔ وہ اڈنبرا میں سنہ ۱۷۷۱ء کو پیدا ہوا۔ اور اپنے باپ کے دفتر میں قانونی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے چھوڑ کر علم و ادب کی طرف متوجہ ہو گیا اس کی پہلی تصنیف گیتوں اور طویل نظموں پر مشتمل ہے سنہ ۱۸۱۴ء میں اس نے اپنا پہلا ناول "ویورلی" شایع کیا۔ جس کی وجہ سے اس کی شہرت بحیثیت ایک مصنف کے قایم ہو گئی۔ اپنی ادبی شہرت کے کمال پر پہونچنے کے بعد سکاٹ پر ایک قرض کی ادائی کا اخلاقی فرض آ پڑا۔ اور اپنی بقیہ زندگی اسی فکر میں کاٹ دی۔ اسکاٹ نے کئی مختصر قصے لکھے۔ نکاح بالجبر کو اس کے ایک دوسرے طویل افسانے آوارہ گرد دلی کی کہانی کی طرح مشہور نہیں تاہم تعجب خیز طور پر مختصر اور واقعات کے تسلسل کے اعتبار سے بے حد گٹھا ہوا ہے (جو اسکاٹ کے لئے عجیب سی بات ہے)

موجودہ قصہ اسکاٹ لینڈ کے۔ الفت" نامی کتاب سے لیا گیا ہے۔ جو لندن میں طبع ہوئی۔

[illegible] محمد محی الدین صاحب قریشی نے اردو میں ترجمہ کیا۔

مس جینیٹ ڈالریمپل لارڈ اسٹیر اور ڈیم مارگریٹ راس کی دختر تھی اس نے بغیر والدین کی اجازت کے لارڈ رتھرفورڈ سے شادی کا عہد و پیمان کیا جو اپنے سیاسی خیالات اور دولت کے فقدان کی وجہ سے ڈالرمپل کے خاندان میں نامقبول تھا۔ دونوں نے سونے کے دو ٹکڑے لئے اور ان پر ہاتھ رکھکر نہایت سنجیدگی سے قسم کھائی۔ کہا جاتا ہے کہ نوجوان لڑکی نے اس عہد کے پورا نہ کرنے کی صورت میں آسمانی بلائیں نکا ہونے کی قسم کھائی تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک شخص نے جو لارڈ اور لیڈی اسٹیر دونوں کا منظور نظر تھا مس ڈالرمپل سے انس اور عاشقانہ ارتباط بڑھانا شروع کیا۔ نوجوان لڑکی نے اس کی درخواست کو رد کر دیا اور اصرار سے وجہ دریافت کرنے پر اپنی پوشیدہ منگنی اور عہد کا حال بیان کیا۔ لیڈی اسٹیر نے جو بغیر چون و چرا حکم منوانے کی عادی تھی (کیونکہ خود اس کا شوہر اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا) جب یہ حال سنا تو اس عہد کو معمولی سی بات خیال کر کے اپنی بیٹی کو نئے عاشق کی التجا منظور کرنے پر مجبور کرنے لگی۔ اس نئے شخص کا نام ڈیوڈ ڈنبار تھا جو ڈیوڈ ڈنبار آف بالڈون کا اکلوتا بیٹا اور وارث تھا۔ اور وگٹن شائر میں رہتا تھا۔ پہلے عاشق لارڈ رتھرفورڈ نے جب یہ خبر سنی تو ایک خط لکھا جس میں ڈالرمپل کو قسم کی یاد دلائی اور اسی پر قائم رہنے کی التجا کی مگر لیڈی اسٹیر نے اپنی بیٹی تک یہ خط پہونچنے نہ دیا اور خود اس کا جواب لکھا۔ کہ اس کی بیٹی نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے والدین اس کے پیمان کے

خلاف ہیں ایک سعادتمند لڑکی طرح اسنے اپنا عہد واپس لے لیا ہے اور اب اسے کالعدم سمجھنا چاہیئے۔

مگر لارڈ رتھ فورڈ نے کہلا بھیجا کہ اس قسم کا جواب سوائے مس ڈالریمپل کے اور کسی کی زبان سے سنکر وہ خاموش نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اس کی وجہ سے وہ عہد کو کالعدم سمجھ سکتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اسے مس ڈالریمپل سے ملاقات کا ایک موقعہ دیا جائے۔ لیڈی اسٹیر کا سابقہ چونکہ ایسے آدمی سے پڑ چکا تھا جو عزم و استقلال اور بہادری کے لئے مشہور ہونے کے علاوہ ملک کے اعلیٰ اور بار سوخ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا جس کو باتوں سے ٹالا نہیں جا سکتا اس لئے وہ لارڈ رتھ فورڈ کو اپنی بیٹی سے ایک آخری ملاقات کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئی۔ مگر اس نے یہ شرط لگائی کہ گفتگو اور ملاقات کے دوران میں وہ موجود رہے گی لارڈ رتھ فورڈ بڑی مشکل سے اس پر راضی ہوا۔ اور ملاقات ہوئی لیڈی اسٹیر نے اس حکم خداوندی کا حوالہ دیا جو صاف طور پر اس عہد کو توڑ دینے کی اجازت دیتا ہے جو لڑکی نے بغیر والدین کی اجازت کے کیا ہو۔ س۔ انجیل کی اسی مضموں کی آیات ثبوت میں پیش کیں۔

لارڈ رتھ فورڈ اپنی معشوقہ کو منانے اور یہ کہنے پر مائل کرنے کی کہ وہ عہد پر قائم ہے بیکار کوشش کرتا رہا۔ مگر وہ ساکت بیٹھی رہی بالکل دہشت زدہ خاموش۔ زرد اور غیر متحرک جیسے مجسمہ۔ صرف اپنی ماں کے حکم پر جو سختی سے دیا گیا تھا اس نے بڑی کوشش کے بعد اپنے قدیم عاشق کو قسم کی یادگار میں سونے کا ٹکڑا واپس کرنے کی جراءت کی اس پر لارڈ رتھ فورڈ کو سخت غصہ آیا اور ماں کی اجازت حاصل کئے بغیر وہ اٹھکر کمرہ سے باہر جانے لگا دروازہ میں رک کر اپنی معشوقہ کے روتے ہوئے چہرہ پر ایک آخری نظر ڈالی جو سوچا نہیں تو کم از کم وقت

ارادی کی بڑی کمزوری تھی اُور آپ خاتون! آپ دنیا کا اعجوبہ ہوں گی۔" اس لیے مس ڈالریمپل نے کہا۔ یہ ایک ایسا محاورہ تھا۔ جس سے اس زمانہ میں بدترین بد دعا کے معنی لیئے جاتے تھے۔ اس کے بعد بدنصیب عاشق سیاحت پر روانہ ہوا اور کبھی واپس نہ آیا اگر رتھرفورڈ خاندان کا آخری نمائندہ ہی اس قصہ کا حرماں نصیب کردار ہے تو وہ اس خطاب کا تیسرا حامل تھا جس کا انتقال ۱۶۸۵ء میں ہوا۔

جینٹ ڈالریمپل اور ڈیوڈ ڈنبار آف بالڈون کی شادی کے لئے اب کوئی رکاوٹ باقی نہ تھی دولہن نے کسی قسم کی پشیمانی یا رنج ظاہر نہ کیا۔ بلکہ بالکل ساکت رہی اور اپنی ماں کے ہر مشورہ اور حکم کی تعمیل کرتی۔ شادی کے دن جو رشتہ داروں اور دوستوں کے کثیر مجمع کے درمیان ہوئی تھی (جیسا کہ اس زمانہ میں رواج تھا) بھی وہ اسی طرح ساکت اور زردرہی۔ اور قارئین۔ ایک خاتون نے جس کا دولہن کے خاندان سے قریبی تعلق ہے اس قصہ کے مصنف کو اطلاع دی۔ کہ دولہن کا ایک چھوٹا سا بھائی جو دولہن کے سامنے گھوڑے پر سوار ہو کر گرجا گیا۔ کہتا ہے کہ دولہن کا ہاتھ جو اس کی کمر کے گرد سے آکر اس کے ہاتھ پر رکھا ہوا تھا سنگ مرمر کی طرح سفید اور سرد تھا۔ مگر نیئے نیئے کپڑوں کی خوشی اور جلوس کی دھوم دھام کی وجہ سے اس نے اس بات کو محسوس نہ کیا گو ایک زمانہ کے بعد اس نے رنج و افسوس کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا

شادی کی دعوت کے خاتمہ پر ناچ ہوا جس میں دلہا دلہن شریک نہ تھے۔ ناچ بڑے زور و شور سے ہو رہا تھا کہ دفعتاً ایک دلآویز چیخ کی آواز سنائی دی جو دلہن کے کمرہ سے آئی تھی۔ اس

زمانہ میں رواج تھا کہ دلہن کے کمرہ کی کنجی کمرہ مقفل کرنے کے بعد دولہن کے کسی عزیز کے پاس رکھ دی جاتی۔ اسے بلایا گیا۔ مگر اس نے شروع میں کمرہ کھولنے سے انکار کیا۔ حتیٰ کہ چیخوں کی آواز اتنی دردناک ہوتی گئی کہ وہ کھولنے پر مجبور ہو گیا تاکہ اس کی وجہ معلوم کرے۔ انھوں نے دیکھا کہ دولھا دہلیز پر پڑا تڑپ رہا ہے اس کے سینہ کے زخم سے خون بہہ کر فرشِ زمین کو آلودہ کر رہا ہے۔ دولہن ڈھونڈنے پر بڑی چمنی کی اوٹ میں پائی گئی۔ بالکل برہنہ سوائے ایک خون آلود نکر کے اس کے بدن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ وہ وہاں منھ چڑا لیے اور دانت پیستے اور مجنونانہ حرکات کرتے ہوئے بیٹھی تھی۔ صرف ایک جملہ لوگوں کے داخل ہونے پر اس کی زبان سے نکلا "لے جاؤ تمہارے حسین دولھا کو"۔ اس خوفناک سانحہ کے کوئی دو ہفتہ بعد تک وہ زندہ رہی۔ شادی ۲۴؍ اگست کو ہوئی اور انتقال ۱۲؍ ستمبر سنہ ۱۶۶۹ء کو۔

بدقسمت بالڈون نے بھی زخموں سے صحت پائی مگر اس واقعہ سے متعلق سوالات کی قطعاً ممانعت کر دی۔ اس کا بیان تھا "مجھ سے اگر کوئی عورت اس مضمون پر گفتگو کرنا چاہتی تو میں اسے جواب نہ دیتا اور عمر بھر بات نہ کرتا۔ اور اگر مرد پوچھ بیٹھتا تو میں اسے ہتک عزت سمجھتا اور ڈوئیل کا مطالبہ کرتا" وہ بھی اس دردناک واقعہ کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہا وہ لیتھ سے ہوئی رُوڈ ہاؤس سوار ہو کر آ رہا تھا کہ دفعتاً گھوڑے سے گر پڑا اور بہت بری طرح زخمی ہوا دوسرے ہی دن ۲۸؍ مارچ سنہ ۱۶۸۲ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ یوں چند سال کے اندر اندر اس دہشت ناک حزنیہ کے کل اہم کردار نابود ہو گئے۔

لوگوں میں اس کی نسبت کئی افواہیں مشہور ہیں کوئی۔ اسے دلہن کا انتقام بتایا ہے۔ اور کوئی لارڈ رتھر فورڈ کا جو چپکے سے آکر قتل کر کے فرار ہو گیا۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عہد توڑنے کی وجہ سے شیطان نے اس کا بدلہ لیا۔

بچے کا خواب

چارلس ڈکنز ۱۸۱۲ء تا ۱۸۷۰ء

ڈکنز سنہ ۱۸۱۲ء میں قصبہ لینڈپورٹ میں جو پورٹسمتھ کے قریب واقع ہے تولد ہوا۔ اس کا باپ محکمہ بحری میں ایک ادنیٰ عہدہ پر ملازم تھا۔ اوائل عمری میں اس کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ جس کا حال اس نے اپنی ناولوں میں کئی جگہ بیان کیا ہے۔ نامہ نگاری کی ابتدائی خدمات انجام دیتے ہوئے اس نے چند مسلسل مضامین لکھے جو بعد میں اسکیچز بائی باز کے نام سے طبع ہوئے۔ اس کے بعد پکوک پیپرس جو ماہانہ اقساط سے چھپتے رہے تھے مجموعہ کی صورت میں شائع ہوئے۔ اس آخرالذکر ناول نے ڈکنز کی شہرت کو چار چاند لگا دیے اور دفعتاً پردہ گمنامی سے نکل کر ایک مقبول عام مصنف کی حیثیت سے ادبیات کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوا۔ جدت اور ندرت خیال عدیم النظیر قوت مشاہدہ اور مذاق کی برجستگی کے ساتھ خزینہ نقوش کا استعمال جو بعض مرتبہ ضرورت سے زائد نظر آتا ہے۔ اس کی تحریری خصوصیات ہیں۔ ڈکنز نہ صرف انگلینڈ بلکہ یورپ بھر میں ایک قابل قصہ نویس مانا جاتا ہے۔ ذیل کا قصہ ڈکنز کے بہترین افسانوں میں سے

سمجھا جاتا ہے - جناب حمدی صاحب کے تراجم میں سے ہے

MOHMAD MAQBOOL DAR
ADLACH MAGAM
PAHAL GAM. KMR.

Interesting short story

بچے کا قول کب

دونوں خورد سال بچے فطرت کی طرف سے ایک عجیب دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ ہر چیز کو ایک خاص گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ قدرت کی لطیف صنعتیں مثلاً پھولوں کی رنگینی نیلگوں آسمان کی بلندی شفاف پانی کی گہرائی ہمیشہ ان کے لئے تعجب کا باعث ہوا کرتی تھی۔

وہ اکثر ایک دوسرے سے کہا کرتے "فرض کرو روئے زمین پر کے تمام بچے مر جائیں، تو کیا یہ پھول، یہ سمندر، یہ آسمان مغموم نہ ہوں گے؟ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور غم محسوس کریں گے۔ کیونکہ کلیاں پھولوں کے بچے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشنما ندیاں جو پہاڑوں کے دامن میں اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی بہتی ہیں سمندر کی اولاد ہیں۔ اور یہ چمکدار ننھے ننھے دھبے (جگنو) جو تمام رات فضا میں آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں ستاروں کے بچے ہیں جب وہ اپنے ہمجولیوں یعنی انسان کے بچوں کو نہ پائیں گے تو یقیناً مغموم ہوں گے۔

ہر شام گرجے کی چوٹی کے نزدیک قبرستان کے اوپر ایک صاف جگمگاتا ہوا ستارا نظر آیا کرتا تھا، یہ نسبتاً بڑا اور چمکدار تھا۔ وہ بلا ناغہ دریچے میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھا کرتے۔ دونوں میں سے جسے پہلے

دکھائی دیتا وہ چلا اٹھتا وہ دیکھو ستارا" اور کبھی کبھی دونوں یک آواز انگلیوں سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے " دیکھو ستارا"

انہیں خوب معلوم تھا کہ وہ کس وقت اور کس جگہ سے طلوع ہوگا وہ اس سے اس قدر مانوس ہو گئے تھے کہ سونے سے بیشتر ایک بار اسے ضرور دیکھتے اور جب بستر پر لیٹتے تو کہتے " پیارے تارے خدا تمہیں برکت دے"۔

اتفاق ایسا ہوا کہ بہن بیمار پڑ گئی اور اتنی کمزور ہو گئی کہ اپنے بھائی کے ساتھ ہیں کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ستارے کو دیکھ نہ سکتی تھی بچے کو اس کا بے حد افسوس تھا۔ وہ جب ستارے کو دیکھتا تو بہن کی طرف منہ موڑ کر کہتا" وہ دیکھو ستارا" یہ سنکر بہن کا کمزور مگر مسکراتا ہوا چہرہ یوں گویا ہوتا خدا میرے بھائی اور ستارے کو برکت دے"۔

وہ وقت جلد ہی آپہنچا جب بچہ تنہا رہ گیا۔ جب بستر پر بہن کا پیارا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ جب قبرستان میں ایک ننھی سی قبر کا اضافہ ہو گیا اور جب ستارے نے اپنی لمبی شعاعیں اکیلے بچے ہی پر ڈالیں اور اس نے اسے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اب شعاعیں پہلے کی نسبت زیادہ روشن تھیں، ان کے زمین پر پڑنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان تک ایک روپہلی راستہ بن گیا ہے، بچہ جب اپنے بستر پر سویا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ لوگوں کا ایک تانتا لگا ہوا ہے جو اس درخشاں راستے پر روحوں کی معیت میں چل رہے ہیں اور ستارہ نور کی ایک وسیع دنیا ہے۔ جہاں بیشمار حسین ان لوگوں کے استقبال

کیلئے کھڑی ہیں۔ تمام منتظر روحوں نے اپنی نگاہیں آنیوالوں پر گاڑ رکھی ہیں۔ بعض جو زیادہ بے تاب تھیں اپنی اپنی قطاروں سے نکل کر ان سے لپٹ گئی ہیں۔ اور ان کی پیشانیوں کو چومنے لگی ہیں۔

ان کی یہ ملاقات ایسا دل خوش کن منظر تھا کہ وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور فرط مسرت سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

لیکن بہت سی روحیں ایسی بھی تھیں جو ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاتی تھیں، اور ان میں سے ایک کو وہ پہچانتا بھی تھا —— ایک کمزور اور زرد چہرہ جو کبھی بستر علالت پر دکھائی دیا کرتا تھا ... یہ اس کی بہن تھی۔

اس کی بہن کی روح دروازہ ہی پر انتظار کرتی رہی۔ اس نے رہنما (جو لوگوں کو اس نور کی دنیا میں لایا تھا) سے دریافت کیا "کیا میرا بھائی آگیا ہے"؟

جواب ملا "نہیں"۔

وہ امیدوارانہ پیچھے کو مڑی۔ بچے نے فرط اشتیاق سے اپنے بازو پھیلا دئے اور چلایا۔

"پیاری بہن! میں یہاں ہوں مجھے بھی لے جاؤ"۔

ننھی بچی نے اپنی روشن نگاہیں اپنے بھائی پر ڈالیں اور اس کی آنکھ کھل گئی —— رات تاریک تھی۔ ستارہ اپنی طویل درخشاں شعاعیں کمرے میں ڈال رہا تھا اور وہ پرنم آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بہن کی وفات کے بعد جب وہ ستارہ کی طرف دیکھتا تو اسی

کی آنکھوں میں مسافر کی ان حسرت پاش نگاہوں کی جھلک پائی جاتی تھی جو دشت غربت میں بار بار اپنے وطن کی طرف اٹھتی ہوں اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔

اس لئے خیال کیا کہ اس کا تعلق صرف زمین ہی سے نہیں ہے۔ بلکہ ستارے سے بھی ہے۔ اور جب اسے اپنی بہن کی روح کا خیال آتا جو ستارے کی طرف پرواز کر گئی تھی تو اس کے خیال کو مزید تقویت پہنچتی۔

کچھ عرصہ کے بعد ان کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا جو اس کا چھوٹا بھائی کہلایا لیکن وہ ابھی بہت چھوٹا ہی تھا اور اس نے ایک لفظ بھی بولنا نہ سیکھا تھا کہ دنیا سے سدھار گیا۔

بچے نے دوبارہ خواب دیکھا۔ ستارے تک شعاعوں کا ایک راستہ بنا ہوا ہے لوگ روحوں کی معیت میں اس پر چلے جا رہے ہیں۔ اور اس کی بہن کی روح نے ان سے دریافت کیا ہے "کیا میرا بھائی آگیا ہے۔؟"

انھوں نے جواب دیا "وہ نہیں بلکہ دوسرا"۔

جب بہن نے اس ننھے بھائی کی روح کو اپنے پہلو میں محبت سے لپٹایا تو بچہ چلا اٹھا۔

"بہن میں یہاں ہوں مجھے بھی لے چلو"۔

اس نے جواب میں اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور مسکرا دی۔

.....ستارہ اسی طرح چمک رہا تھا۔

وہ بچہ اب جوان تھا۔ ایک دن اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا کہ بوڑھا خادم داخل ہوا اور عرض کی۔

"حضور کی والدہ قضا کر گئی ہیں، میں ان کی آخری دعائیں

اور برکتیں آپ کے لیئے لایا ہوں" رات کو خواب میں اسے پھر وہی منظر نظر آیا اور حسب سابق اس کی بہن کی روح نے رہنما سے دریافت کیا۔

"کیا میرا بھائی آگیا ہے۔؟"

جواب ملا بھائی نہیں تمہاری والدہ آئی ہیں۔

ماں کے اپنے دو بچھڑے ہوئے بچوں سے دوبارہ جا ملنے پر ستارے کی فضا میں ہر طرف مسرت کی لہریں دوڑ گئیں ذرہ ذرہ جوش مسرت سے رقصاں نظر آتا تھا بچہ اس منظر کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور چلا اٹھا۔"امی جان! پیاری بہن! پیارے بھائی! میں یہاں اکیلا پڑا ہوں مجھے بھی بلا لو"۔

انھوں نے جواب دیا "تمہارے آنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔"

— ستارہ حسب معمول چمک رہا تھا۔

وہی بچہ اب ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے بال دن بدن سفید ہو رہے تھے آتشدان کے سامنے کرسی کے بازو پر کہنی ٹیکے مغموم بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک بار پھر ستارہ اور اس کی وسیع فضا اس کے سامنے تھی

اس کی بہن کی روح نے رہنما سے پوچھا۔

"کیا میرا بھائی آگیا ہے۔؟"

جواب ملا "نہیں۔ تمہاری بھتیجی آئی ہے"۔

اس ادھیڑ عمر کے آدمی نے جو کبھی بچہ تھا اور جس نے تھوڑی دیر ہوئی اپنی شفقت بھری گود سے قضا و قدر کے حکم سے اپنی پیاری بھیجی کو جدا کیا تھا۔ دیکھا وہ متبرک روح ان تینوں کے

ساتھ ہے۔ وہ بولنے لگا۔

"میری بچی کا سر میری بہن ...... کے سینے پر ہے۔ اس کے بازو میری والدہ کی گردن میں حمائل ہیں۔ اور اس کے پیروں کی طرف میرا ننھا بھائی بیٹھا ہے۔ اب میں اس کی جدائی کو برداشت کر لوں گا۔ اور یہ سب خدا کی مہربانی ہے جس کے لئے سب تعریفیں ہیں"

—— ستارہ فضا میں حسب معمول جگمگا رہا تھا۔ وہ بچہ اب ایک پیر مرد تھا اس کے صاف خوبصورت چہرہ پر جھریاں پڑ چکی تھیں اس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے اور اس کی کمر جھک گئی تھی۔

ایک رات وہ بستر پر پڑا تھا، اس کے بچے اس کے گرد کھڑے تھے وہ اپنے بچپن کے لہجے میں چلایا۔

"وہ دیکھو ستارا!"

اس کے لڑکے بالے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

"افسوس ابا جان کا آخری وقت آگیا!"

پیر مرد نے نحیف آواز میں کہا۔

"میں اب مر رہا ہوں میری عمر کا لباس اب اتر رہا ہے اور میں ستارے کی طرف ایک بچے ہی کی طرح جا رہا ہوں۔ اے خدا! تیرا ہزار ہزار شکر ہے، میں اب ان سے جا ملوں گا جو میرے انتظار میں ہیں"

—— ستارہ اس وقت بھی چمک رہا تھا، اور اب بھی اس کی قبر پر چمکتا ہے۔

غرورِ نسب

تھامس ہارڈی - ۱۸۴۰ تا ۱۹۲۸ء

تھامس ہارڈی ۱۸۴۰ء میں ڈورسٹ شائر میں پیدا ہوا ابتدائی عمر میں وہ تعمیرات کی تعلیم کے لئے ڈوچسٹر اور آخر میں لندن گیا۔ اس کا پہلا ناول (جو ۱۸۷۱ء میں طبع ہوا) مسودہ کی صورت میں جارج میرڈتھ کی نظر سے گذرا۔ اس نے اس کی بڑی تعریف کی اور مصنف کو مبارک یاد دی اس کے شائع ہو جانے کے بعد ہارڈی ڈوچسٹر واپس گیا۔ جہاں اس نے بقیہ عمر پر فضا دیہات میں سکون سے تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ اس کی بے شمار تصانیف میں سے چار مجموعے مختصر قصوں کے ہیں۔ ان میں ہارڈی کی مخصوص صفت اس کی کردار پر مضبوط گرفت اور ماحول اور فضا پیدا کرنے میں خاص مہارت، اسی صفائی کے ساتھ جھلکتی ہے جیسی کہ اس کی ضخیم ناولوں میں۔

موجودہ قصہ اس کی مشہور کتاب۔ "اے گروپ آف نوبل ڈیمس" سے لیا گیا ہے۔ جس میکملن اینڈ نے شائع کیا ہے۔ اس کے مترجم محمد محی الدین صاحب ہیں

ان لوگوں کو جو سٹیپل فورڈ کی روایات سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ گزشتہ صدی کے وسط میں اس پرشاد ساہوکاران ہے۔ ٹوٹی پڑک قابض تھا وہ ہر اس جائداد پر جس میں ذرا بھی نفع کی توقع ہو تی جا ہے وہ کتنی ہی الجھنوں

میں کیوں نہ پڑی ہوئی ہو۔ اس کے ہونے والے مالکوں کو ان کے
والدین کی زندگی ہی میں قرضہ دینے پر تیار رہتا۔ اس کا یہ کاروبار
انتہائے پیمانہ پر چلتا تھا جس کی نظیر انگلستان بھر میں ملنی ناممکن تھی ٹوٹمی
پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کئی نوابوں اور امیروں
کا مختار عام بھی۔ جس کی وجہ سے اسے اپنے مذکورہ بالا خاص کاروبار
میں کھل کھیلنے کا خوب موقع ملتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک رشتہ دار
کوئی بڑا مفکر تھا جس کو بدقسمتی سے عدالت کی اس غلط فہمی کی بنا
پر کہ اس نے کسی قانونی دستاویز پر جعلی دستخط بنائی عمر بھر کے لئے
جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ٹوٹمی نے اپنے اسی رشتہ دار سے قانونی تعلیم
حاصل کی تھی۔ آدمی تھا سمجھدار۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد مستقل عزم
کر لیا کہ اپنے اس قیمتی خزانہ کو لوگوں پر لٹانے میں کبھی ضایع نہ کریگا
بلکہ خود اپنے لئے محفوظ اور وقت ضرورت کام لینے کے قابل
بنائیگا۔

میں اس کے پیشہ کی ابتدا اور عالم شباب ہی میں قابل رشک
مالی ترقی کی نسبت کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرا قصہ اس زمانہ سے تعلق
رکھتا ہے جب کہ اس کی عمر کے ساتھ دولت بھی ترقی کے آخری
زینہ پر پہونچ چکی تھی۔ وہ کئی گاؤں کا تنہا مالک تھا۔ اسٹیپل ووڈ کا
قصبہ مع اس شاندار محل کے جس کے اندر وہ رہتا تھا۔ مار لاٹ
شرٹن اباس۔ مل پول کا پورا قصبہ۔ اپوک کی زمینات۔ غرض بہت کچھ
اس کا تھا میں اس کی غیر منقولہ جائداد کی آدھی فہرست بھی نہیں
گنا سکتا۔ اور چونکہ اس کو مرے ایک عرصہ دراز گذر چکا ہے
اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جس کسی سے وہ
زمین خریدتا تو جب تک اس زمین کے ہر حصے پر اپنے ہاتھ سے

کو نیچے مار کر اس کی زرخیزی کا امتحان نہ کر لیتا۔ اس کی قیمت ادا نہ کرتا یہ اس کی جائداد کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے غالباً بڑا مشکل کام ہوگا۔

ہمارے قصہ کی ابتدا کے وقت اس کی عمر اسی سال کے اوپر تھی اور اس کا بیٹا مر چکا تھا لیکن دو پوتے زندہ تھے۔ بڑا پوتا جس کا نام بھی متھو بھی پیٹرک ہی تھا شادی شدہ تھا۔ اور مستقبل قریب میں بوڑھے کو پڑپوتے کی امید تھی۔ عین اس زمانہ میں اس کا مزاج بگڑا۔ عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرض الموت میں مبتلا ہے۔ وصیت نامہ کی رو سے بوڑھے نے اپنی کل جائداد اپنے بڑے پوتے کو دیدی تھی۔ جس کے لاولد ہونے کی صورت میں وہ چھوٹے پوتے کو پہونچتی۔ اور اگر اس کا بھی کوئی وارث پیدا نہ ہو تو چند دور کے رشتہ داروں کو جن کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔

بوڑھے متھو کی بیماری کے زمانہ میں اس کے بڑے پوتے کے ہاں لڑکا ہوا۔ اس کا باپ گو ایک مفکروں کے خاندان کا رکن تھا مگر خود کوئی بڑا چالاک نہ تھا۔ پیٹرک خاندان میں صرف وہی ایک تھا جس کی دلی ایمانداری اور قناعت ہمیشہ اس کی حرص و آز کے راہ میں حائل رہی۔ اور اسی وجہ سے اس نے اپنی شادی کسی دولتمند خاندان میں نہ کی تھی۔ اس کی بیوی ایسے گھرانہ سے تعلق رکھتی تھی جس کی مالی حالت بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ خود اس کے خاندان کی اس کے دادا کے عالم وجود میں آنے سے قبل تھی۔ یعنی اس کا خسر شہر کا ایک معمولی سا تاجر تھا۔ لیکن وہ حسین تھی نہایت حسین۔ اس نے اسے دیکھا۔ ملاقات پیدا کی

ارتباط بڑھایا۔ دونوں کے دلوں میں عشق کی آگ بھڑکی۔ اور آخر اپنی بیوی کے مسحور کن جمال کی تاب نہ لاسکے اس لئے ایک دن اظہار محبت کیا۔ ادھر سے شرماشرمی سے منظوری ملی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ مگر اب تک اسے اپنے اس حسن انتخاب پر افسوس کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ بیوی کا نام انیتا تھا وہ سخت بیمار تھی۔ اور اسی حالت میں لڑکا تولد ہوا۔ اس کا شوہر اسکی صحت کے طرف سے سخت مضطرب اور پریشان تھا۔

بظاہر کوئی بات اندیشہ ناک نہ تھی۔ وہ اور اس کا لڑکا دونوں تیزی سے صحت پا رہے تھے کہ دفعتاً تبدیلی رونما ہوئی۔ جو زیادہ تر برائی کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ وہ پھر بیمار پڑی اور اتنی جلد گھلنے لگی کہ امید منقطع ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ اس کی حالت چراغ سحری کی سی ہے تو اپنے شوہر کو بلا بھیجا۔ اور اس کے گھبراہٹ میں آنے اور اطمینان دلانے پر کہ کوئی دوسرا سننے والا نہیں اس نے سنجیدگی سے اسے قسم کھلوائی کہ وہ ہر حالت میں بچہ کی حفاظت اپنی جان کے برابر کریگا کیونکہ موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی دم توڑ دے۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ کے بوڑھے ہونے تک زندہ رہے۔ اس کے شوہر نے بلا تامل قسم کھائی۔ اس کے بعد وہ کہنے لگی کہ وہ اپنی روح پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہوئے مر نہیں سکتی۔ اور قبل ازیں کہ اس کے لبوں پر ہمیشہ کے لئے خاموشی کی مہر لگ جائے اسے ایک خوفناک اعتراف کرنا ہے۔ اور اس نے لڑکے کی ولدیت کے متعلق ایک ایسا افسانہ بیان کیا جو اب تک یقین کی ہوئی حالت سے بالکل متضاد تھا۔

ٹوکھی پیٹرک (بوڑھے ٹوکھی کا پوتا) گو ایک حساس طبیعت

آدمی تھا۔ مگر پوری کوشش صرف کر کے اس نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ اس کی زندگی کے اس سخت آزمائشی لمحہ میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اسے اسی طرح چھوڑ کر وہ دوڑتا ہوا اپنے دادا کے بستر موت کے نزدیک گیا۔ اور اس پر کل حقیقت کا انکشاف کیا۔ بچہ کی پیدائش۔ اس کی ولدیت کے متعلق اس کی بیوی کا اعتراف اور اپنی بیوی کی موت —— اس نے دادا سے التجا کی کہ اگر وہ اس سے محبت رکھتا ہے تو اٹھے اور وصیت نامہ میں کم از کم کچھ ایسی ترمیم کرے کہ ناخواندہ مہمان محروم الارث قرار دیا جائے۔ بوڑھے نے بھی اس معاملہ کو اپنے پوتے ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اور زیادہ اصرار کی ضرورت نہ پڑی۔ اسنے دوسری وصیت لکھوائی جس میں جائداد اس کے بڑے پوتے کی زندگی تک کے لئے محدود کر دی گئی اور اس کے دوسری شادی کر لینے کی صورت میں اس بیوی کی کسی مرد۔ اولاد پر اس کے بعد ڈیوڈ (چھوٹا پوتا) اور اس کی اولاد وارث قرار دی گئی۔ اور یوں نوزائیدہ مولود جائداد کی وراثت سے محروم اور خاندان میں شامل ہونے کے ناقابل ٹھہرایا گیا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بوڑھے موتھی پٹرک کا انتقال ہو گیا۔ پرپوتے کی ولادت کی خبر اس کے لئے سخت بدشگون ثابت ہوئی۔ اس کو دلی صدمہ پہونچا۔ اس کو خاندان کے پرانے قبرستان میں دفن کر دیا۔ اور کتبہ پر نام کے بعد "مخبرو منصفین" کا اضافہ کر دیا گیا۔ بیوی اور دادا دونوں کو دفن کر کے موتھی پٹر نے اسی خاموش و افسردہ طریقہ سے زندگی گذارنی شروع کی جس کا وہ بچپن سے عادی تھا۔ اس نے یہ کہکر اپنے دل کو اطمینان دلایا کہ فوری اور مناسب انتظام کی وجہ سے اس "گھریلو غاصب"

کا اچھی طرح انسداد ہو گیا ہے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ گاؤں ہی کی کسی اچھی لڑکی کو منتخب کر لینے کے بعد اس سے شادی کریگا مگر انسان بعض وقت خود اپنی ذات کو جاننے پہچاننے میں ناکامیاب رہتا ہے۔ گذشتہ تازہ واقعہ نے اس کے دل میں صنف نازک کی جانب سے ایک بے اعتباری پیدا کر دی اور حالانکہ حسن کے کئی منتخب نمونے اس کی نظر سے گذرے مگر وہ کسی سے بھی عاشقانہ ارتباط بڑھانے کی جراءت نہ کر سکا۔ ہر عمدہ لباس کے اندر اسے ایک جال نظر آتا تھا جو اسے پھانسنے کے لئے بچھایا گیا ہو ایک مرتبہ جو واقع ہوا حالانکہ اس وقت سب کچھ کتنا پر سکون اور دلفریب نظر آتا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی گذر سکتا ہے" دل میں کہتا بہر حال میں اس خطرہ میں دوبارہ پڑنا نہیں چاہتا"۔ اس لئے وہ شادی سے رکا رہا۔ اور اپنی اس خواہش کو کہ اسٹیپل فورڈ کے لئے کوئی جائز وارث پیدا کرے دل ہی دل کے اندر دبا دیا ٹموتھی لڑکے کو بہت کم دیکھتا۔ اپنی قسم کو معمولی طور پر پورا کرنے کا انتظام کر دینے کے بعد وہ اس کی پرورش اور حفاظت اور نیز گھر کی نگہداشت کی جانب سے بے فکر ہو گیا۔ کبھی کبھی اپنے عہد کو یاد کر کے وہ لڑکے کے کمرہ میں جاتا۔ سرسری نظر سے اس کو دیکھتا بھالتا۔ اور نرس کو چند خاص ہدایتیں دیکر واپس ہو جاتا اور اپنی تنہا زندگی کے افسردہ دن مطالعہ میں کاٹتا۔ یوں وہ اور لڑکا دونوں اسٹیپل فورڈ کی چار دیواری میں ایک دوسرے سے بیگانہ پرورش پاتے رہے حتیٰ کہ اسی طرح دو تین سال گذر گئے ایک دن جب کہ وہ باغ کی سیر کر رہا تھا۔ ایک بنچ پر اپنی ناس کی ڈبیہ بھول گیا

لڑکا وہاں کھڑا ہوا ہے - وہ نرس کی آنکھ بچا کر کمرہ کی قید سے نکل
بھاگا تھا - اور ڈربیہ سے کھیل رہا تھا - حالانکہ متواتر چھینکیں بار بار
اسے پریشان کرتی تھیں - لموتھی جس نے لڑکے کی جانب سے
اپنا دل پتھر کا بنا لیا تھا - اس کے مستقل مزاج طفلانہ کھیل میں
دلچسپی لینے لگا - اس نے لڑکے کے چہرہ کو غور سے دیکھا - آنکھوں
اور ناک سے پانی بہتا تھا - اس نے تعجب سے دیکھا کہ وہ بالکل اپنی
ماں کے مشابہ ہے وہ لڑکپن کی قابل رحم حالت پر غور و فکر میں
محو ہو گیا - خاص طور پر ان لڑکوں کی جو ماں کی گود - باپ کی محبت
اور رشتہ داروں کی شفقت سے علیحدہ کر دئیے گئے ہیں - جس کی
زندہ مثال خود اس کے پیش نظر تھی -

اس وقت اس کی انسانی فطرت میں پوشیدہ اور کبھی نہ کبھی منظر
عام پر جلوہ گر ہونیوالی محبت اس کی عقلمندی (اس کے الفاظ میں)
کو شکست دینے لگی - معصوم ریو پرٹ سے محبت کرنے کی ایک نازک
سی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی - ریو پرٹ! آہ یہ نام مرحومہ
نے یہ رکھا تھا - جب کہ لڑکے کی رسم اصطباغ اسی کے کمرہ
میں ادا ہوئی تھی حالانکہ اس کا شوہر اس کے نام کو بالکل غیر مناسب اور
خاندانی ناموں سے جدا تصور کر رہا تھا - اور اب چونکہ حقیقت
حال منکشف ہو چکی تھی اس نے جان لیا تھا کہ یہ نام نوجوان
مارکوئیس آف کرسٹ منسٹر ڈیوک آف ساؤتھ ویسٹر لینڈ کے
فرزند کا تھا - جس پر انیتا - اس کی بیوی ، دل و جان سے فدا تھی
اور جو مرتے مرتے شوہر کو اس نام کے راز کو کھولنے کی التجا یہ چند
ٹوٹے پھوٹے جملوں میں اشارہ کر گئی تھی -

کوئی اچھا مقرر نہ تھا۔ لیکن لڑکا بڑا باتونی تھا۔ وہ گفتگو کے دوران میں سکوت کا منتظر رہتا تھا تاکہ وہ اپنی میٹھی سریلی آواز سے کمرہ کو چمکا دے۔ ہر روز صبح میں اپنا وقت اس طرح کاہلی سے گذار دینے کے بعد پیٹرک اپنے کمرہ میں جاتا تھا جہاں وہ کبھی بلند اور کبھی دھیمی آوازیں لڑکے کے پاس جانے اور اس سے محبت کرنے پر اپنے دل کو ملامت کرتا اور عہد کرتا پھر کبھی وہ اس کے کمرہ میں قدم نہ رکھے گا۔ اس عہد پر وہ صرف تھوڑی دیر یا زیادہ سے زیادہ ایک دن تک عمل پیرا رہتا۔ خوش قسمتی سے انسانی زندگی میں ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مگر ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ مزاج کے اس طرح بدل جانے کے بعد پھر اس میں کایا پلٹ ہو جائے۔

لڑکے کی عمر کے ساتھ پیٹرک کی محبت میں بھی ترقی ہوتی گئی حتیٰ کہ صرف روبرٹ اس کی زندگی کا واحد مرکز و مقصد بنگیا۔ گو کہ پیٹرک کے اندر موروثی حرص و آز کا زیادہ نہیں تو کچھ تو حصہ تھا اسے اپنے بھائی کی حالت پر رشک و حسد ہونے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ آنریبل ہیرٹ مونٹ کی بیٹی کے ساتھ اس نے شادی کر لی ہے مگر اب چونکہ پیٹرک کو اپنے یا اپنی بیوی کے لڑکے کی اعلیٰ نسبی کا علم ہو چکا تھا۔ اس لئے اسے کم از کم کچھ تسلی تو ضرور حاصل ہوئی اور اس کا رشک و حسد کم ہوتا گیا۔ اپنے بھائی کی شادی کے بعد اس کی ہونے والی اولاد کے نسب اور ربوبرٹ کے خاندان کے متعلق جوں جوں وہ زیادہ غور و خوض کرتا گیا اس کی مردہ بیوی کا الزام جو اس کی نظر میں سخت تھا رفتہ رفتہ کم ہونے لگا اس کی بیوی نے باوجود ایک معمولی سے تہری تاجر کی بیٹی ہونے کے نہایت پاکیزہ اور عمدہ مذاق طبیعت کا ثبوت دیا تھا۔ اور

اس کا بیٹا اسماً اور خطاباً اگر نہیں تو کم از کم نسباً انگلستان کے ایک قدیم ترین شریف خاندان کا نمائندہ تھا۔

"آخر کار وہ ایک اعلیٰ مذاق کی عورت ثابت ہوئی۔" وہ اپنے آپ سے تفاخرانہ انداز سے کہتا "اس نے اپنی نظر انتخاب ایک ڈیوک کے گھرانے کے وارث پر ڈالی۔ اگر بجائے ڈیوک کے وہ کسی معمولی آدمی سے محبت کرتی تو بھی وہ اس سلوک کی مستحق نہ تھی جو میں نے اس کے یا اس کے لڑکے کے ساتھ روا رکھا۔ وہ شخص جس سے ایڈتا کو محبت تھی شریف تھا۔ اور اس کا نہیں میرا بیٹا بھی شریف ہے چاہے میں نہ ہوں۔"

اس کے بعد وصیت نامہ کی خطرناک تبدیلی پر تاسف و پشیمانی کا آنا ضروری تھا۔ اور تھوڑے عرصہ بعد ایسا ہی ہوا۔ "مجھے ہرگز لازم نہ تھا کہ بچہ کو وراثت سے محروم کرتا ــــ ہرگز نہیں" اس نے کہا "مجھے چاہیے تھا کہ میں اور زیادہ خوش ہوتا۔ شریف خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ ورنہ واقعات کی اصلی رو میں وہ ایک معمولی گمنام اور رذیل خاندان کا رکن ہوتا۔"

وہ قدامت اعتقاد کا آدمی تھا۔ اور بادشاہ کو خلیفۃ اللہ تسلیم کرنا گویا اس کے مذہبی فرائض میں داخل تھا۔ نہ صرف بادشاہ ہی کو بلکہ اس کے لواحقین اور رشتہ داروں کی بھی بڑی تعظیم وتکریم کرتا۔ اس کی بیوی کا طرز عمل اس نقطہ نظر سے اسے احسن معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نسبت غور کرتا کہ وہ کیسے معمولی۔ سود پر روپیہ چلا لینے والے۔ بدنام اور شرابی خاندان کا فرد ہے ممکن تھا کہ ان ان گنت برائیوں کا کچھ حصہ موروثی طور پر بچہ کو ملتا جس سے اس کی عمر کے آخری زمانہ میں اسے سخت روحانی اذیت

اور جسمانی تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔ مگر اب ـــ اس کا امکان ہی نہ تھا۔ لڑکا ایسے شریف خاندان کا رکن تھا جس کا برائیوں سے پاک ہونا ایسا ہی ثابت تھا جیسا کہ مسیح کا نجات دہندہ ہونا۔ کیا اس کی بیوی نے ایک ماہر باغبان کی طرح درخت کا خراب حصہ کاٹ کر اس میں اچھا پیوند نہیں لگایا تھا۔ آخر تو یہ نوبت پہونچی کہ صحیح الدماغ ٹموتھی ہر روز رات میں سوتے وقت اور صبح میں جاگنے کے بعد خدا کے سامنے صدق دل سے سربسجود ہو جاتا کہ اس کا لڑکا کوئی کمینہ خاندان سے نہیں۔

وہ اس خاص کیفیت دماغی میں تھا جو پیٹرک خاندان کے لئے مخصوص تھی۔ خلش آمیز اطمینان یہی جذبہ ٹموتھی کے دل میں بھی پیدا ہوا اور بڑھتا چلا گیا۔ پیٹرک خاندان والے نوابی کی پوجا بھی کر لیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پر بھی نوچتے جاتے تھے۔ اسحاق والٹن مچھلی پر جو خیالات رکھتا تھا بعینہ وہی خیالات مرحوم پیٹرک اور اس کے جانشینوں کے حکومت جائداد غیر منقولہ امرا۔ اور خود مختاری کی نسبت تھے۔ ایذا پہونچانا اور پرستش کرنا۔ دونوں ساتھ ساتھ۔ جس کا سمجھنا وجوہات کی دسترس سے باہر ہے۔ مگر عمل کرنا بالکل آسان۔ یہ دنیا میں ہوتا ہی چلا آیا ہے۔

ایک دن ٹموتھی کے بھائی ایڈورڈ نے حقارتاً کہا کہ گو ٹموتھی کا بیٹا اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر رہا ہے۔ مگر اس کے مستقبل میں سوائے کسی دفتر کی کلرکی یا تجارت کے اور کچھ نہیں حالانکہ خود اس کا بیٹا اگر کوئی ہوا۔ تو چونکہ آنریبل ہارٹ کے خاندان سے ہوگا۔ اس لئے نہایت متاثر ہوگا۔ ٹموتھی نے جب یہ سنا

تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اس کے بھائی کے اس ہوائی قلعے کو توڑ دینے کے لئے اس کا صرف ایک اشارہ کافی ہے۔

وہ اس نئی فضا میں بچے سے اور زیادہ دل چسپی لینے لگا۔

اب اس نے تاریخ کا مطالعہ شروع کیا یہ تاریخ وہ تھی جس میں اس نامور خاندان کا حال جو ڈیوک آف ساؤتھ ڈیسٹر لینڈ کے خطابات سے معزز کیا گیا تھا۔ ان کی ابتداء خوش قسمت چارلس کی دوبارہ تخت نشینی کے بعد ان کا عروج کمال دربار اور عوام میں انکی عزت وغیرہ کی تفصیلات شرح وبسط کے ساتھ درج تھیں اس نے اپنے دماغ میں ان تحائف کا حساب لگایا جو بادشاہ کی جانب سے ان کو ملے تھے۔ جاگیرات خرید کردہ جائداد برابر کے خاندانوں میں شادیاں۔ محلات۔ اور سیاسی اور فوجی فتوحات علم وادب کی خدمات تصانیف۔ غرض ہر چیز اس کو ازبر ہو گئی اس نے ڈیوک آف ساؤتھ ڈیسٹر لینڈ کی خاندانی تصاویر کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ اسطرح کہ کوئی ماہران کی قدامت اور اہمیت کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اور اس دوران میں اس کے پیش نظر روبرٹ کا چہرہ بھی رہتا۔ تاکہ وہ تاریخی نقوش وہ مخصوص نشانیاں جو وانڈائیک اور لیلی نے ڈیوک خاندان میں ظاہر کئے تھے اسے روبرٹ کے چہرہ میں بھی نظر آئیں۔

جب روبرٹ لڑکپن کے دلفریب ترین حصہ عمر کو پہونچا اور اس کے پرشور قہقہوں کی آواز اسٹیپل فورڈ ہاؤس کے ایک سر سے دوسرے تک گونجنے لگی تو وہ اندوہ نہانی جو ہرک کے لئے سوہان روح بن رہا تھا۔ حد سے باہر ہو گیا۔ اگر کسی کو وہ خود اپنی ملکیت کا وارث بنانے کے لئے خوشی سے آمادہ تھا تو وہ

صرف رَوبرٹ ہی تھا لیکن آہ! خود اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے پیر پر کلہاڑی ماری تھی۔ اور روبرٹ کو محروم الارث قرار دیا تھا۔ اور چونکہ وہ دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے جائداد اس کے انتقال کے بعد اس کے بھائی ایڈورڈ کو ملتی جو اپنی بیوی کی اعلیٰ خاندانی پر لاف و گزاف کیا کرتا تھا۔

کاش وہ اپنے دادا کی پہلی وصیت کو بحال رہنے دیتا!

دونو وصیتیں اس قبضہ میں اب تک تھیں پہلی پوشیدہ اور دوسری ظاہر۔

رات کے وقت جب نوکر سو جاتے وہ پوشیدہ طور پر اپنے خزانہ کا کمرہ کھولتا اور دونوں کا مطالعہ کرتا اور خواہش کرتا کہ کاش پہلی دوسری بن جاتی اور دوسری پہلی۔ حتیٰ کہ دونوں وصیت نامے اسے لفظ بلفظ حفظ ہو گئے۔

آخر کار وہ وقت آگیا جب کہ صبر کا پیالہ چھلکنے والا تھا۔ ایک رات بچہ کی صحبت کا دیر تک لطف اٹھانے کے بعد وہ برداشت نہ کر سکا کہ رَوبرٹ محروم ہی بنا رہے۔ بچے کے سو جانے کے بعد وہ خزانے کے کمرہ میں داخل ہوا اور وصیت ناموں کی تاریخیں بدل دیں۔

اس نے پہلی پر جو وہ دن بعد کی تاریخ بنا دی۔ جس سے پہلی دوسری اور دوسری پہلی ہو گئی دوسری صبح اس نے دلیری سے اعلان کر دیا کہ اسے ایک نیا وصیت نامہ دستیاب ہوا ہے۔

اس کے بھائی نے بغیر شک وشبہہ کے اسے تسلیم کر لیا۔ بوڑھے کا میلان طبع دیکھتے ہوئے اسے شروع ہی سے اس کی اُمید نہ تھی اور نہ شروع ہی سے اس وصیت نامہ کو جس کی رو سے وہ وارث بنتا تھا

وقت کے اعتراف سے قطعاً نا واقف تھا چنانچہ اس سے ٹموتھی کا ہاتھ دوسرے وصیت نامہ کو تسلیم کرانے اور پہلے کو رد کرانے میں ہاتھ بٹایا۔ اور پھر زندگی پہلے کی طرح بسر ہونے لگی کیونکہ اس سے واقعات حاضرہ میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی۔ اور مستقبل خوشباش لوگوں کیلئے ابھی کوسوں دور تھا۔

زمانہ اسی طرح گذرتا چلا گیا۔ مگر روبرٹ نے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی کوئی مثال پیش نہیں کی۔ لڑکے کو دیکھتے ہوئے یہ خیال کبھی پیدا نہ ہو سکتا تھا کہ وہ آئندہ چل کر کچھ ہو گا۔ اسی زمانہ میں اتفاقاً ٹموتھی پیٹرک کی ملاقات ایک ڈاکٹر سے ہوئی۔ جو اس کی مرحوم بیوی کا خاندانی طبیب تھا۔ گو انیٹا کی شادی کے بعد ڈاکٹر نے اس کا علاج اس وجہ سے نہیں کیا تھا کہ اب پیٹرک خاندان کا ڈاکٹر اس کا علاج معالجہ کرتا تھا۔ مگر اس سے قبل وہ کئی مرتبہ اس کو مختلف امراض سے صحت دلا چکا تھا۔ یہ ڈاکٹر بڈھو تھا میں رہتا تھا۔ اور ٹموتھی جو کسی کام کی وجہ سے اپنے خسر سے ملنے گیا تھا اس سے ملا اور اس کی عالمانہ گفتگو اور پیشہ ورانہ قابلیت سے بہت متاثر ہوا۔ ملاقات گہری ہو جانے کے بعد ڈاکٹر نے اس نے ایک خاص قسم کے مالیخولیا کا تذکرہ کیا ہے جس کا شکار ٹموتھی کی بیوی ورانتاً تھی تذکرہ یہ تھا کہ وہ چند قسم کے خوابوں کو حقیقت واقعہ جانتی تھی۔ اس نے اشارۃً پوچھا کہ کیا ٹموتھی نے اپنی بیوی کی زندگی میں اس قسم کا کوئی واقعہ دیکھا ہے۔؟ اس نے بتلایا کہ انیٹا کے لڑکپن ہی سے اس میں اس قسم کے آثار پائے جاتے تھے اور اس نے اس کی تشریح تفصیلی طور پر کی۔ حتیٰ کہ آئندہ وارجان ٹموتھی کو یقین ہو گیا کہ انیٹا کا مرتے وقت اعتراف اسی قسم

کے جنون کا ایک خواب ہے۔

"تم خاموش کیوں ہو"؟ ڈاکٹر نے دفعتاً رُکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا۔" ٹموتھی نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

مگر اب بھی وہ اسے ماننے کے لئے پوری طرح تیار نہ تھا۔ اس لئے صاف دلی سے کام لے کر پوری کہانی ڈاکٹر سے بیان کر دی۔ جسے سوائے اس کے مرحوم دادا کے اور کسی انسانی کان نے نہیں سُنا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا کہ یہ واقعہ بالکل اسی قسم کا ہے جس کا وہ انیٹا کے بچپن میں مرض کے آثار دیکھکر متوقع تھا۔

پیٹرک نے تحقیق میں بڑی کد و کاوش کی۔ مگر واقعات کا تقابل کرنے اور ڈیوک کے حالات زندگی خاص طور پر دریافت کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی غریب بیوی کا اعتراف حقیقت سے بالکل دُور اور در اصل ایک خوشگوار خواب کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ انیٹا اپنے عالم خیال میں اس قسم کے ایک نوجوان کی پرستش کرتی تھی در حقیقت نوجوان مارکوئیس جو ایک روشن دماغ اور بے داغ چال چلن کا امیر زادہ تھا۔ انیٹا کی شادی کے ایک سال قبل ہی یورپ کی تفریح کے لئے چلا گیا تھا۔ اور اس کی موت کے بعد تک واپس نہ آیا۔ نوجوان لڑکی کی اس سے محبت صرف ایک خیالی واقعہ اور خواب تھا باقی کچھ نہیں۔

ٹموتھی گھبر گیا۔ لڑکا اس سے ملنے دوڑا۔ اس کی روح کو سخت صدمہ پہنچا۔ آخر کار اس کی جائداد کا وارث ایک ادنیٰ درجہ کے فرد کے سوا اور کوئی نہ تہا اس کی قسمت میں نہ لکھا تھا کہ کوئی شریف امیر زادہ اس کا جانشین بنتا۔ صحیح ہے کہ رودرٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خود اس کا بیٹا تھا۔ اور وہ شان و شوکت اور دبدبہ جس کا وہ اپنے بیٹے کو وارث خیال کرتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ایڈورڈ کے بچے کو حقیر جانتا تھا۔ اب ہمیشہ کے لئے رویرٹ سے جدا ہو گیا تھا۔ اب اس کے چہرہ میں اس کیلئے کوئی دلچسپی باقی نہ تھی۔ نہ وہ تاریخی نشان نہ وہ موروثی نقوش۔ جو صدیوں سے برسر حکومت ہونے کی علامات تھیں۔

اس کا سلوک رویرٹ کے ساتھ دن بدن خشک ہوتا گیا۔ اس نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ سہیڑک خاندان کے مخصوص علامات بچے چہرہ پر نمودار ہو رہے ہیں۔ بجائے ابھری ہوئی ستوان خوبصورت ناک کے جو ڈیوک آف ساوتھ ویسٹر لینڈ سے مخصوص تھی پھیلے ہوئے نتھنے اور تنگ بینی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وہ آنکھیں جو اسے نیلی اور دلکش نظر آتی تھیں اب بھوری بن رہی تھیں۔ اور ان میں بھولے کا نشان پیدا ہو رہا تھا جو اس کے ایک قابل نفرت رشتہ دار کی آنکھ میں تھا۔ اور بجائے خوبصورت منھ اور پتلے پتلے ہونٹ کے جن سے نکلی ہوئی تقریریں پارلیمنٹ کو تھرا دیتی تھیں اور جواب تک کتب خانوں کی سنہری جلدوں میں محفوظ ہیں، موٹے موٹے حبشی کے جیسے ہونٹ اور پھیلا ہوا دھانہ — اس کے دادا کے اسی عزیز جیسا جو کسی شریف آدمی کے وصیت نامہ پر جعلی دستخط بنانے کی سزا میں جلا وطن کیا گیا تھا۔ نظر آرہا تھا۔

افوہ اس کا دماغ جلاوطنی کی سزا کے تصور سے کانپ اٹھا جو اگر دنیا کو اس کی اپنی کمینہ حرکت کا علم ہو جائے تو اسے ملنے والی تھی۔

وہ اس جائداد کا شان و شوکت کی طرف اشارہ کرتا تھا جہاں تک وہ کبھی پہنچ نہ سکتا تھا۔ بچپہ اس کا تھا اسی لئے وہ اپنی ذات سے بھی متنفر ہو گیا کاش یہ میرا کھلاتے ہوئے۔ یہی ڈیوک کا لڑکا ہوتا" وہ خیال کرتا تھا۔

وہی نوجوان مارگو میں جس سے رشتہ ملانے کا خیال ٹموتھی کو رات دن ستاتا تھا ایک مرتبہ اتفاقاً تفریح کرتا ہوا شکار کے لئے اسی نواح میں آیا۔ ٹموتھی پیٹرک نے اس سے ملاقات کی اس کے چہرہ کو تعریفی نظر سے دیکھا۔ دوسرے دن جب وہ کتب خانہ میں بیٹھا اُسی بات پر غور کر رہا تھا کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔

"کون ہے"؟

"رُوپرٹ" !

"رُوپرٹ !۔ اے غاصب۔ فاسق۔ بڑا امیرزادہ بننے چلا ہے۔" دُور ہو پیٹرک ! ٹموتھی نے دانت بھینچ کر کہا۔ "تیری آواز کیوں اس مارگو منس جیسی تھی۔ جسے میں نے کل دیکھا۔ ؟ لڑکا اندر داخل ہوا۔ تیری آنکھوں میں اس جیسی چمک کیوں تھی ؟ اور تحکمانہ انداز گویا تو صدیوں سے حکومت کرنے کا عادی ہے آخر کیوں ؟

"بائیں بابا۔ آپ اس کی امید کیسے کر سکتے تھے۔ جب کہ وہ ہمارا رشتہ دار نہیں ؟"

"مردک تجھے ہونا چاہیئے تھا۔" ٹموتھی نے غراتے ہوئے کہا۔

مارخیم

(رابرٹ لوئی اسٹیونسن۔ ۱۸۵۰ تا ۱۸۹۴)

اسٹیونسن اڈنبرا میں پیدا ہوا۔ اُس کے والدین کہ آبائی پیشہ

انجینیری تھا۔ مگر اسٹیونسن نے صحت اور شوق کے فقدان کی وجہہ سے قانون کو انجینرنگ پر ترجیح دی۔ اور ۱۸۷۵ء میں سندِ وکالت حاصل کر لی۔ مگر بجائے وکالت کے اس نے مضمون نگاری شروع کی۔ صحت کی خرابی کی وجہہ سے مناسب آب و ہوا کی تلاش میں اس کی زندگی کا بڑا حصہ سیر و سفر میں گذرا۔ آخر کار وہ جزیرہ سیاموا میں مقیم ہوا۔ اور وہیں انتقال کیا۔ اس چند مختصر افسانے جو شاہکار سمجھے جاتے ہیں ان میں سے موجودہ قصہ مارخیم۔ وسائل کی خوبی اور تاثر کی برجستگی کے لئے مشہور رہے انسانی فطرت اور اہرمن اور ایزد کی قوتوں کا منظاہرہ جو اس قصہ کی روح رواں ہے مارخیم کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ "مارخیم" پہلے سالنامہ انون میں ۱۸۸۵ء کو طبع ہوا اور اس کے بعد عربی من نامی مجموعہ میں شامل کیا گیا۔ جس کا ترجمہ ملک محمد باقر صاحب کے قلم سے درج ذیل ہے۔

"ہاں ہمارے ہاں مختلف قسم کے بردے ہیں۔ بعض خریدار ناواقف ہوتے ہیں تو میں اس وقت ان سے اپنے اس زائد علم کا فائدہ اُٹھاتا ہوں۔ اور بعض مشتبہ ہوتے ہیں" یہ کہتے ہوئے دوکاندار نے موم بتی کو اس طرح اوپر اُٹھایا کہ اس کی تمام روشنی گاہک کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تو اس صورت میں اپنی اس نیکی کا نفع حاصل کرتا ہوں"

مارخیم ابھی ابھی دن کی روشنی میں گلی سے آیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ابھی تک پوری طرح دوکان کی تاریکی سے آشنا نہ ہوئی تھیں اس لئے ان چبھتے ہوئے الفاظ پر جب کہ موم بتی کا شعلہ اس کی آنکھوں کے قریب آگیا۔ اس نے منہ ایک طرف پھیر لیا۔

دوکان دار ایک نہایت مکروہ اور خوفناک ہنسی ہنسا" تم میرے پاس کرسمس کے دن آئے ہو" اس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔" اس دن جب کہ تم جانتے ہو۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ دوکان بند کر رکھی ہے اور یہ اصول بنا رکھا ہے۔ کہ آج کوئی کام نہ ہوگا۔ اس لئے تمہیں اس کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ تمہیں میرے اس وقت کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو میں نے آج حساب کی پڑتال کے لئے مقرر کیا تھا۔ علاوہ ازیں تمہیں اس طرز عمل کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو تم نے اس وقت اختیار کیا ہے۔ میں نفسیات کا ماہر ہوں اور تم سے کوئی استفسار نہ کروں گا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جب کوئی خریدار مجھ سے آنکھیں نہیں ملاتا تو اسے اس کا بھی معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔" دوکاندار نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور پھر اسی کاروباری لہجہ میں مگر طنزاً کہنے لگا تم حسب معمول پھر بیان کر سکتے ہو کہ تم نے مال کہاں سے پایا۔ کیا اب کے بھی یہ تمہارے مرحوم چچا کی الماری سے نکلا ہے؟۔ اس کو چیزیں جمع کرنے کا عجیب شوق تھا۔"

یہ کہکر پستہ قد، گول مول اور زرد رو دوکان دار پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا اور اپنے سنہری چشمہ کے فریم کے اوپر سے مارخیم کو دیکھنے لگا جس کے چہرہ سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

" اس دفعہ تم غلطی پر ہو۔" مارخیم نے کہا میں بیچنے کے لئے نہیں آیا بلکہ خریدنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے پاس اب فروخت کرنے کے

نادرات روزگار ختم ہو چکے ہیں۔ اور میرے چچا کی الماری میں جو کھٹا تک باقی نہیں رہا۔ اس دفعہ میرا مدعا صرف ایک دوشیزہ کے لئے کرسمس کا تحفہ خریدنا ہے اور واقعی میں تمہارے اوقات میں بے حد مخل اور حارج ہوا ہوں جس کی میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں کیونکہ کل غفلت سے یہ کام نہیں ہو سکا۔ اور آج دوپہر کے کھانے پر مجھے یہ تحفہ پیش کرنا ہے اس کے علاوہ تم بھی جانتے ہو کہ ایک امیر لڑکی سے شادی کرنے میں غفلت نہیں برتنی چاہیئے۔"

ایک سکوت طاری ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوکاندار اس بیان کی صداقت پر غور کر رہا ہے۔ گھڑیوں کی ٹک ٹک اور گاڑیوں کا زم شور جو قریب کی شاہراہ سے گزر رہی تھیں، اس سکوت کے وقفہ کو پُر کر رہا تھا۔

آخر دوکاندار بولا۔ "بہتر ہے جناب" آپ میرے پرانے گاہک ہیں اور اگر آپ کے لئے واقعی ابھی شادی کرنے کا موقع ہے تو میں اس میں روڑا نہیں اٹکانا چاہتا، یہ لیجیئے یہ خاتون کے لئے نہایت اچھا تحفہ ہے یہ دستی آئینہ پندرھویں صدی کا ہے۔ اور ایک اچھے ذخیرہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ خریداروں کے واسطے دینے والے کا نام محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی آپ کی طرح شریف آدمی ہے۔ جو اپنے چچا کی جائداد کا مالک بنا تھا۔"

دوکاندار یہ کہتا ہوا آئینہ کو الماری سے اٹھانے کے لئے جھکا مارجیم کے بدن میں برقی رو کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایک لمحہ کے لئے مرتعش ہو گئے۔ اور ہنگامہ خیز جذبات اس کے چہرہ پر آ گئے اس نے سنبھلتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی حالت کو درست کرتے ہوئے آئینہ

[illegible]

آئینہ؟" اس نے کھانستے ہوئے کہا کیونکہ اس کی آواز گلے میں آکر رک گئی تھی "آئینہ؟ کرسمس کے لئے ہرگز نہیں۔" دوکاندار نے استفسار کیا "اور کیوں نہیں؟"

مارخیم نے ناقابل بیان انداز سے دوکاندار کو دیکھا اور کہا۔ "تم مجھ سے پوچھتے ہو کیوں نہیں؟ ذرا اس کو دیکھو اس میں دیکھو اپنے آپ کو دیکھو۔ کیا تم اس کو دیکھنا پسند کرتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نہ میں اور نہ کوئی اور آدمی پسند کریگا۔"

دوکاندار نے چونک کر اس طنز کا جواب دیا "تو میرے خیال میں آپ کے تحفے کے لئے میری دوکان میں کوئی چیز نہ ملیگی۔"

مارخیم بولا۔ "میں تحفہ کے لئے کوئی معقول چیز طلب کرتا ہوں اور تم مجھے یہ دیتے ہو یہ صدیوں کی یادگار۔ گناہوں اور جرموں کی یادگار"۔ دوکاندار نے گاہک کو بغور ملاحظہ کیا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ مارخیم مذاق نہیں کرتا تھا بلکہ سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا دوکاندار بولا "مگر اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟" دوسرے نے جواب دیا "تم کسی سے محبت کرتے ہو نہ کوئی تم سے محبت کرتا ہے؟ تم صرف روپیہ جمع کرنا جانتے ہو اور کچھ نہیں؟" دوکاندار نے ذرا ترش روئی سے جواب دیا۔ "میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا جانتا ہوں" مگر پھر فوراً ہی لہجہ بدل کر قہقہہ لگایا اور کہا "دیکھو یہ تمہاری شادی کا معاملہ ہے۔ اور یقیناً اس دوشیزہ کا جام صحت پیتے رہے ہو گے!"

مارخیم نے اسے روکتے ہوئے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا کیا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟ مجھے اس کے متعلق بتاؤ"۔

دوکاندار نے جواب دیا "میں نے؟ کسی سے محبت کی ہے؟ میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا۔ اور نہ ان خرافات کے لئے آج میرے پاس وقت ہے۔ تم آئینہ لو گے یا نہیں؟"

مارخیم نے جواب دیا۔ "مگر اس میں جلدی کیا ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا نہایت ہی خوش کن ہے اور نہ زندگی اتنی طویل اور [illegible] کبھی

خوشی کے موقع پر ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ہمیں چاہیے کہ جو کچھ حاصل ہو سکے وہ حاصل کریں اس گپ شپ میں وقت صرف کرنا سب سے بہتر ہے آؤ ہم ایک دوسرے کے متعلق باتیں کریں اور دوئی کا پردہ اٹھا دیں اور اپنے راز کو کھول دیں۔ ممکن ہے کہ ہم دونوں دوست بن جائیں ؟"

دوکاندار نے کہا "میں صرف یہ کہوں گا کہ یا تو سودا خرید دیا دوکان سے باہر چلے جاؤ"۔

مارخیم نے جواب دیا بالکل درست تو اچھا مجھے کچھ اور دکھاؤ۔

دوکاندار ایک دفعہ پھر آئینہ کو رکھتے کے لئے جھکا۔ مارخیم اس کے قریب ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ اور ایک گہرا سانس لیا اس وقت مختلف قسم کے جذبات اس کے چہرہ سے ظاہر ہو رہے تھے۔

تمہارے لئے اچھا رہے گا" دوکاندار بولا لیکن جب وہ کھڑا ہو رہا تھا تو مارخیم اپنے شکار پر جھپٹا۔ خنجر ہوا میں چمکا اور دوکاندار کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ دوکاندار لڑکھڑا کر گرا تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔

مارخیم نعش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے پر ایک خموشی طاری تھی موم بتی جل رہی تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا یہ نعش اس وقت تک یہاں رہے گی۔ جب تک کوئی اس کو ڈھونڈ نہ نکالے۔ ڈھونڈلی جائیگی اور پھر تو گیا وہ مردہ گوشت کا ڈھیر کوئی ایسی آواز پیدا کریگا۔ جو تمام انگلستان میں گونج اٹھیگی۔ اور دنیا کو تعاقب کی صداؤں سے پر کردیگی یہ خیالات ابھی اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے کہ پہلے ایک پھر دوسری اور پھر تیسری اور پھر اسی طرح مختلف گھڑیوں نے مختلف رفتار اور آوازسے دن کے تین بجائے۔ اس سنسان کمرہ میں ان آوازوں

لئے اس کو گھبرا دیا اور اس نے کمرہ میں ٹہلنا شروع کر دیا اس لئے کمرہ کے آئینوں میں بہت سے عکس دیکھے جو اسے گھور رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ان عکسوں کو دیکھتیں اور دل کا راز معلوم کرتیں۔ اس کے قدموں کی چاپ کمرے کی خاموشی کو توڑتی اور اسے بری معلوم ہوتی اور اسی طرح جب وہ ٹہل رہا تھا۔ تو اس کو اپنے طریقہ عمل میں ہزاروں نقص نظر آنے لگے۔ اس کو چاہیئے تھا کہ اس سے زیادہ خاموش وقت اس کام کے لئے منتخب کرتا۔ اس کو چاہیئے تھا کہ جائے واردات سے عدم موجودگی کی شہادت بنا لیتا اپنے خنجر اس کام کے لئے نہیں استعمال کرنا تھا۔ بلکہ دوکاندار کا گلا گھونٹ کر مار دینا تھا۔ اس کو ذرا زیادہ دلیر ہونا چاہیئے تھا۔ اور نوکر کو بھی قتل کر دینا چاہیئے تھا۔ غرض کہ اس کو تمام انتظام دوسرے طریقہ پر کرنا چاہیئے تھا۔ اس اثنا میں زیادہ خوفناک خیال اس کے دماغ میں اس طرح چکر لگانے لگے۔ جس طرح کسی ویران جگہ میں چوہے دوڑتے ہیں۔ سپاہی کے ہاتھ اس کے کندھے پر پڑیں گے اور اس کا تمام بدن ان کے مس سے پکڑی ہوئی مچھلی کی طرح مرتعش ہو گا۔ عدالت کا کٹہرا۔ قید کی کوٹھری پھانسی کا تختہ وغیرہ تمام چیزیں سرعت کے ساتھ اس کے دماغ سے گزرنے لگیں۔ اور گلی کے لوگوں کا خوف فوج کی طرح اس پر محاصرہ کئے ہوئے تھا وہ سوچ رہا تھا کہ انھوں نے اس لڑائی کی آواز ضرور سنی ہو گی۔ اور وہ اب بھی اسی طرف کان لگائے ہوں گے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ تمام دنیا بجائے کرسمس منانے کے میزوں کے گرد خاموش بیٹھی ہوئی وہ رسی بن رہی ہو گی۔ جس سے اس کو پھانسی دی جانیوالی ہے کبھی اس کو خیال آتا کہ وہ آواز پیدا کئے بغیر نہیں چل سکتا اور وہ ٹھہر جاتا۔ کبھی گھڑیوں کی ٹک ٹک اسے اتنی بلند معلوم ہوتی کہ وہ کانوں

کو بند کرنے پر مجبور ہو جاتا کبھی کمرے کی خاموشی اس پر گراں گزرنے لگتی اور وہ زور زور سے اس طرح چلنے لگتا۔ گویا کہ ایک کاروباری آدمی اپنے کام میں مصروف ہے۔

یکایک باہر گلی میں سے ایک پر مذاق آدمی نے ڈنڈے سے دوکان کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار کا نام لیکر پکارا مارخیم کا خون اس کی رگوں میں جم کر رہ گیا اس نے مردہ کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ وہ بالکل چپ تھا اور تمام آوازوں کے لئے اس کے کان بھر گئے۔ وہ خاموشی کے بحر بے پایاں میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو چکا تھا۔ اور اس کا جو نام کسی وقت پکارے جانے پر اس کو فوراً متوجہ کرتا تھا۔ اب اس کے لئے ایک بے معنی حقیقت رکھتا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد اس آدمی نے کھٹکھٹانا بند کر دیا اور چلا گیا۔

اب اس کے لئے کام کو ختم کرنے کا موقع تھا کہ وہ اس نعش سے دور بھاگ جائے لنڈن کی بیشمار آبادی میں گم ہو جائے۔ ایک آدمی آ چکا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد دوسرے کے آنے کا امکان تھا۔ علاوہ اس کے کام کر چکنے کے بعد اس سے فائدہ نہ اٹھانا محض حماقت پر مبنی تھا۔ اب اس کو دولت کی ضرورت تھی جو اس کا انتہائے مدعا تھا اور چابیوں کی جو دولت کا وسیلہ تھیں

اس نے نیم دروازہ کی طرف دیکھا جس میں سے روشنی اور راہروؤں کے سائے سینما کی فلم کی طرح گزر کر سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے۔ اور پھر اس نے ایک حرکت کی اور مقتول کے نزدیک پہنچ گیا۔ زندگی کی روح جسم سے متعود تھی بازو زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ گردن دوہری ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی مارخیم اس کو چھوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے شانے پکڑ کر لاش کو اٹھایا پیٹھ کے بل لٹا دیا۔ لاش بالکل ہلکی اور نرم تھی۔ بازو اس طرح زمین پر پڑے تھے گویا ٹوٹے ہوئے ہیں۔ چہرے سے اندرونی جذبے کا کوئی پتہ نہ ملتا تھا

ہویدا نہ تھی مگر موم کی طرح زرد تھا۔ اور داہنی کنپٹی خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ جو مارخیم کے لئے اذیت دہ تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے لاش سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جرم کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ یہی ڈھانچہ ہر ایک جذبہ کا حامل تھا اور اب اس کی زندگی کی مشین اسی طرح قائم کر دی گئی تھی۔ جس طرح کہ ایک گھڑی ساز گھڑی کو انگلی سے بند کر دیتا ہے۔

آخر کار ان خیالات کو دماغ سے نکال کر اس نے چابیوں کو تلاش کیا اور دوکان کے کھلے دروازہ کی طرف بڑھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور جب مارخیم دروازے کے قریب پہنچا تو اس کو سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے پھر ارادہ کو مضبوط کر کے دروازہ کھول دیا۔

مدہم اور دھندلی روشنی فرش پر پڑنے لگی۔ بارش کا شور اتنا زیادہ تھا کہ مارخیم کو اس میں سے مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ قدموں کی چاپ، فاصلہ پر سپاہیوں کا چلنا۔ روپیہ کے گننے کی آواز مینہ کے گرنے کے ساتھ اس کو سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے پاگل ہو رہا تھا کہ وہ مکان اکیلا نہیں۔ ہر طرف سے اس پر موجودات کا رعب چھایا ہوا تھا وہ دوکان کی اوپر کی منزل پر بہت سے لوگوں کو چلتے سن رہا تھا۔ اور جب وہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا تو اس کے آگے اور قدم بھی نہایت خاموشی سے چڑھ رہے تھے۔ اور پیچھے سے اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بہرا ہوتا اور اس ذہنی اذیت سے محفوظ رہتا۔ اس کا سر اس کی گردن پر ہر طرف بار بار حرکت کرتا اور آنکھیں ہر سمت جلدی جلدی پھرتیں۔ سیڑھی کے چوبیس زینے اس کے لئے چوبیس عذاب تھے۔

پہلی منزل پر تین دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جو اس کو تین توپوں کے دہانے نظر آ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش اپنے گھر کی دیواروں میں محصور ہوتا اور [illegible]

کے انتقام سے خائف تھا کہ مبادا اس کے جرم کے لئے کوئی شہادت مہیا کر دے یعنی ہو سکتا ہے کہ ٹھوس دیواریں منور اور شفاف بن کر اس کے جرم کو فاش کر دیں ہو سکتا ہے کہ مضبوط تختے اس کے پاؤں تلے سے نکل جائیں اور اس کو گرفتار کر لیں ان توہمات سے وہ خائف تھا اور درحقیقت یہی اوہام خدا کا انتقام کہلاتا ہے۔ مگر وہ خدا کی طرف سے مطمئن تھا کیونکہ اس کے عذر ایسے تھے جو خدا جانتا تھا اور جو انصاف پر مبنی تھے۔

جب وہ گول کمرہ میں بحفاظت پہنچ گیا اور دروازہ بند کر چکا تو سابق خطرات کے خیال نے اس کو پھر گھیر لیا۔ کمرہ سامان آرائش سے خالی تھا۔ فرش کوئی نہ تھا۔ تصویریں چوکھٹوں کے بغیر دیوار پر الٹی لٹک رہی تھیں۔ مختلف بوسیدہ الماریاں کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ مارخیم نے الماری میں ایک ایک کنجی لگانا شروع کی۔ یہ نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور ہو سکتا تھا کہ الماری خالی ہو۔ مگر اس کی مصروفیت نے اس کو مطمئن رکھا باہر گلی میں مینھ کی آواز اب اسے غیر معمولی معلوم نہ ہو رہی تھی۔ ایک طرف سے پیانو کی سریلی اور دلکش آواز آ رہی تھی۔ بچے گلی میں دوڑ رہے تھے اور گرجا سے پادری کی لطیف آواز سنائی دے رہی تھی۔

الغرض وہ یوں مصروف بیٹھا ہوا تھا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور وہ یکایک گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ ایک آدمی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ کھٹ سے دروازہ کی چٹخنی کھلی۔ اور پٹ کھل گئے۔

خوف سے مارخیم کا دم خشک ہو رہا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے سے قاصر رہا کہ آنے والا کون ہے۔ کیا اسی مردہ نے چلنا شروع کر دیا ہے یا پولیس کے آدمی ہیں۔ یا کوئی اتفاقی گواہ ہے۔ جو اس کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے آ رہا ہے۔ مگر جب ایک آدمی دروازے کے اندر داخل ہوا دوستانہ انداز میں ہنسا۔

اور اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر دیا تو مارخیم کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے" اس نے نہایت دلخوش کن لہجہ میں سوال کیا مارخیم کھڑا ہو گیا۔ اور تعجب آمیز انداز میں اس کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کی آنکھیں اس کو دھوکا دے رہی تھیں مگر نہیں وہ پوری جسامت میں اس کے سامنے کھڑا ہو۔ بعض دفعہ اس کو شک ہونے لگتا کہ وہ کوئی ارضی ہستی نہیں معلوم ہوتی مگر پھر وہ عام آدمیوں کی طرح اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اور اس نے پھر عام آدمیوں کی طرح یہ سوال کیا کیا آپ دولت تلاش کر رہے ہیں؟

مارخیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا میں تمہیں مطلع کرتا ہوں۔ کہ مالک مکان کی ملازمہ اپنے کام سے فارغ ہو چکی ہے۔ اور جلدی یہاں پہنچ جائے گی۔ اگر تم یہاں پائے گئے تو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

"تو کیا تم مجھے جانتے ہو؟" قاتل نے سوال کیا۔

آنے والے نے ہنستے ہوئے جواب دیا آپ مجھے مدت سے عزیز ہیں اور میری دیرینہ خواہش ہے کہ آپ کی مدد کروں مارخیم چلایا تم کون ہو؟ شیطان۔

دوسرے نے جواب دیا میری شخصیت اس خدمت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی جو میں آپ کے لئے انجام دینے والا ہوں

مارخیم نے جواب دیا " ڈال سکتی ہے ڈالتی ہے کیا میں تم سے مدد لوں نہیں ہرگز نہیں۔ تم سے نہیں۔ تم مجھے نہیں جانتے خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔

آنے والے نے جواب دیا میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہیں باطن تک

جانتا ہوں"۔

مارخیم چلایا "مجھے جانتے ہو؟ ایسا کون ہو سکتا ہے میری زندگی خود مجھ پر عیاں نہیں میں ہمیشہ اپنی فطرت کو دھوکا دیتا رہا ہوں تمام آدمی ایسا کرتے ہیں۔ تمام آدمی اس پردے سے بہتر ہوتے ہیں جس میں وہ بظاہر لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں انہیں زندگی ہر طرف کھینچے پھرتی ہے۔ اگر ان کو اپنے آپ پر قابو ہو۔ اور اگر تم ان کے چہرے دیکھ سکو تو تم ان کو مختلف پاؤگے اور وہ تمام پیغمبر نبی اور قائد ہوں گے۔ میں گناہوں سے لدا ہوا ہوں لیکن میرے پاس ان کے لئے نہیں جن کو خدا جانتا ہے پھر اگر مجھے موقعہ ملے تو میں سب کچھ ظاہر کر دوں"۔

مجھ پر؟ آنے والے نے استفسار کیا۔

قاتل نے جواب دیا میرا خیال تھا تم نہایت طباع ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ چونکہ تم یہاں موجود ہو اس لئے میرے دل کا راز سمجھ لوگے۔ مگر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگانا چاہتے ہو۔ خیال کرو کہ میرے اعمال کیا ہو سکتے ہیں میں دیوتاؤں میں پیدا ہوا۔ اور دیوؤں میں زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ حالات کے دیوؤں میں اور پھر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگاتے ہو؟ کیا تم میرا باطن نہیں دیکھ سکتے؟ کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مجھے گناہ سے نفرت ہے؟ کیا تم میرے صاف ضمیر کو نہیں دیکھ سکتے جس پر گناہ کی سیاہی کا کوئی دھبہ نہیں۔؟"

جواب ملا تم نے اپنے جذبات نہایت اچھی طرح بیان کئے۔ مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں یہ نکات میری عقل سے بالاتر ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم نے کن حالات کے زیر اثر کیا گیا۔ بہر حال تم راہ راستہ سے بھٹک رہے ہو مگر وقت گزر رہا ہے۔ اور ملازمہ نے دیر لگا دی ہے مگر وہ قریب آ رہی ہے اور اس کا قریب آنا تمہارے لئے پھانسی کا قریب

آتا ہے۔ کیا میں تمہاری مدد کروں! تمہیں بتاؤں کہ دولت کہاں رکھی ہے
مارخیم نے سوال کیا۔ اس کا عوض کیا ہوگا۔
دوسرے نے جواب دیا میں اپنی خدمت کرسمس کے تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں۔"
مارخیم بولا" نہیں میں تمہاری مدد بالکل نہ لونگا خواہ میں پیاس سے مرجاؤں میں اس جام سے پانی نہیں پیونگا۔ جس کو تمہارے ہاتھ میرے لبوں کے ساتھ لگائیں میں انکار کرنے کی ہمت کو برقرار رکھوں گا خواہ تم اس کا یقین نہ کرو مگر میں تمہیں دیتا ہوں کہ میں گناہ نہیں کرونگا؟
آپ نے طنزاً کہا۔ قریب المرگ آدمی کا اپنے گناہ پر افسوس کرنا کوئی بات نہیں۔
مارخیم نے جواب دیا۔ کیونکہ تم اس کے اثر کا یقین نہیں رکھتے
دوسرے نے کہا" میں اس کو اور زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یعنی جب زندگی ختم ہو جاتی ہے تو میرا کام ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی میری خدمت کرنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ یعنی اپنے گناہوں پر افسوس اور اس طرح مسرور ہونا چاہتا ہے میں جابر نہیں ہوں مجھے آزماؤ میری مدد قبول کرو۔ اور اپنی زندگی کے باقی لمحات اچھی طرح گزارو۔ میں ابھی ایک مرنے والے کے پاس سے آرہا ہوں۔ اس کا کمرہ دوستوں سے پر تھا۔ جو اس کے آخری الفاظ سن رہے تھے۔ مگر جب میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا جو رحم کے خلاف چقماق کی طرح سخت تھا تو وہ ہنس رہا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی مرتے وقت خدا سے صلح کرلی تھی۔
مارخیم نے کہا" اور کیا تم مجھے بھی ویسا ہی سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ میرے دل میں گناہ کرنے کے سوا اور کوئی جذبات نہیں؟ میرا دل اس خیال پر اچھل رہا ہے۔ کیا فطرت انسانی کے متعلق تجربہ نے تمہیں یہی

سکھایا ہے؟ اور کیا قتل کا عمل اتنا برا ہے کہ نیکی کو اس کے بعد ہمیشہ کے لئے برباد کہہ دیا جائے؟

دوسرے نے جواب دیا قتل میرے لئے کوئی مخصوص گناہ نہیں۔ تمام گناہ اسی طرح قتل کے برابر ہیں۔ لیکن میں گناہ کا تعاقب کرتا ہوں اور اس کی تکمیل کے بعد تک اس کو دیکھتا رہتا ہوں۔ میں نیکی کا بھی تعاقب کرتا ہوں اور یہ حقیقت مجھے اب معلوم ہوئی ہے کہ گناہ اور نیکی میں میں ناخن بھر کا فرق نہیں۔ ہر ایک موت کے فرشتہ کے لیے وراثتی ہے۔ گناہ جس کے لئے میں زندہ ہوں اعمال میں نہیں پایا جاتا بلکہ ضمیر میں۔ مجھے گنہگار آدمی عزیز ہے نہ کہ گناہ کا عمل جس کے نتائج بعض اوقات کسی پیغمبر کے عمل سے بھی بہتر ہو سکتے ہیں۔ اور میں تمہاری مدد اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ تم نے دوکاندار کو قتل کیا ہے۔ بلکہ تم مارنعیم ہو۔"

مارنعیم نے جواب دیا میں اپنا دل تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں گا یہ جرم جو تم نے دیکھا ہے میرا آخری جرم ہے اس سے میں نے کئی سبق حاصل کئے ہیں یعنی یہ کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ مجھے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اس جرم کا سبب میری غربت تھی بعض انسانوں میں ایسی صفات ہوتی ہیں جو ان کو ایسا کام کرنے نہیں دیتیں مگر وہ مجھ میں نہ تھیں میں خوشی کا بھوکا تھا اور اس لئے میں نے یہ کام کیا۔ مگر آج اس جرم کے بعد مجھ میں اور حوصلہ کی طاقت عود کر آئی ہے جو مجھے پھر مارنعیم بنا دیگی۔ میں پھر آزاد آدمی ہوں۔ میں اپنے آپ کو تبدیل کئے ہوئے پاتا ہوں۔ اب یہ ہاتھ صرف نیکی کے لئے استعمال ہوں گے اور اس دل میں صرف نیکی کا خیال ہوگا۔"

آنے والے نے کہا "تو تم یہ روپیہ اسٹاک ایکسچینج پر استعمال کرو گے جہاں تم قبل ازیں کئی ہزار روپیہ ضائع کر چکے ہو۔"

مارنعیم نے کہا مگر اس دفعہ منافع حقیقی ہوگا

دوسرے نے کہا۔ مگر اس دفعہ تم پھر ضایع کر دو گے"۔

مارحیم بولا مگر نصف میں اپنے پاس رکھوں گا

جواب ملا۔ تم وہ بھی ضایع کر دو گے۔

مارحیم کی پیشانی پر پسینہ کے سفید سفید قطرات چمکنے لگے تو پھر کیا ہوا" وہ بولا۔ فرض کرو میں سب کچھ ضایع کر دوں گا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں پھر پنجہ افلاس میں گرفتار ہو جاؤں گا اور دوبارہ پھر وہی کوشش ہوگی۔ حتیٰ کہ میں بہتر ہو جاؤں گا۔ مجھ میں نیکی بدی دونوں کا مادہ موجود ہے جو مجھے دو طرف کشاں کشاں لیے پھرتا ہے۔ میں ایک چیز کی محبت نہیں کرتا بلکہ سب کی۔ میں غریب پر ترس کھاتا ہوں اور کسی امیر کی مخلصانہ ہمنشینی کو روا رکھتا ہوں اور اس کو دل سے چاہتا ہوں کیا تمہارا خیال ہے کہ میری زندگی کی نا خدا صرف میری بدطینتی ہے؟ اور کیا میری صفات حسنہ ہمیشہ خوابیدہ رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔

آنے والے نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ مگر تم کو دنیا میں آئے ہوئے چھتیس سال ہو چکے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ انقلاب زمانہ کے ساتھ تم دن بدن گر رہے ہو پندرہ سال ہوئے جب تم چوری کے نام سے گھبرا اٹھے تھے تین سال ہوئے تم قتل کے نام سے کانپ جاتے تھے۔ مگر اب کوئی ایسا جرم یا کوئی ایسا کمینہ فعل ہے جس سے تمہیں خوف معلوم ہوتا ہو؟ تم دن بدن نیچے اور نیچے کی طرف جا رہے ہو اور تمہاری اس رجعت کو موت کے سوا کوئی نہیں روک سکتا"۔

مارحیم بولا یہ بالکل صحیح میں نے کسی حد تک بدی کا ساتھ دیا ہے اور ہر ایک انسان ایسا کرتا ہے۔ بڑے بڑے اچھے آدمی ماحول کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں"۔

دوسرے نے رکتے ہوئے کہا میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ جس کے

جواب پر میں تمہارے اخلاق کی کیفیت بتاؤنگا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم کسی گناہ میں کامیاب ہو کر اپنے آپ کو سدھار سکتے ہو ؟"

کسی گناہ میں!" مارخیم نے مضطرب لہجہ میں دہرایا۔ "نہیں میں ہر دفعہ نیچے ہی نیچے جاتا رہا ہوں۔"

دوسرے نے جواب دیا "تو پھر تسلی رکھو۔ تم کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے اور تمہارے خیالات کبھی عملی جامہ نہیں پہن سکتے"۔ مارخیم دیر تک خاموش کھڑا رہا حتیٰ کہ آنے والے نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "تو پھر کیا" مارخیم بولا "عزت ؟"

دوسرے نے جواب دیا "کیا تم اس کو بارہا پہلے نہیں آزما چکے ؟ تین سال گزرے جب کہ میں نے تم کو گرجا میں اقرار گناہ کرتے ہوئے تلافی کے لیے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ کیا تمہاری آواز سب سے زیادہ بلند نہیں تھی ؟"

اس موقع پر دروازہ کی گھنٹی بجی اور آنے والے نے فوراً ناصحانہ انداز بدلتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا۔ "ملازمہ واپس آگئی ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے اطلاع دی تھی کہ وہ آنے والی ہے۔ اب تمہارے لیے ایک اور راستہ کھلا ہے۔ اور وہ یہ کہ تم ماما کو اندر داخل کر لو۔ اور کہو کہ اس کا مالک بیمار ہے۔ دیکھو کسی طرح کا خوف یا اضطراب تمہارے چہرہ سے ظاہر نہ ہونے پائے۔ اور جب لڑکی اندر داخل ہو جائے۔ تو پھر اس کے ساتھ اسی مہارت کے ساتھ وہی سلوک کرو۔ جو اس کے مالک کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اس طرح سے تمہارا آخری خطرہ ختم ہو جائیگا۔ اس کے بعد تم اپنی خوشی سے دوکان لوٹ سکتے ہو۔ یہ خطرہ کے پردہ میں تمہارے لیے مدد ہے۔ جلدی کرو"۔ وہ چلایا "دوست جلدی کرو۔ تمہاری زندگی اس وقت ترازو کے پلڑوں میں مل رہی ہے۔ جلدی کرو اور اس پر عمل کرو۔"

مارخیم نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "اگر میری قسمت میں برے کام

کرنا ہی لکھے ہیں تو کوئی کام نہ کرونگا گو جیسا کہ تم کہتے ہو کبھی میں چھوٹے سے چھوٹا رذیل کام کرنے کے لئے طیار ہو جاتا تھا۔ مگر اب ان سب سے مخلصی پانے کے لئے میں کچھ نہ کرونگا۔ مجھ میں گو نیکی کی محبت فنا ہو چکی ہے مگر ابھی تک بدی کی نفرت زائل نہیں ہوئی ؎

آنے والے کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی۔ اس کے نقوش مدہم پڑ گئے۔ اور آہستہ آہستہ وہ غائب ہو گیا۔ مگر مارخیم نے اسے دیکھنے یا اس پر سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی کیونکہ وہ کچھ سوچتا ہوا فوراً نیچے اتر گیا جہاں نعش کے قریب موم بتی جل رہی تھی۔ دوکان پر ایک ہیبت ناک سکوت طاری تھا۔ وہ رکا اور مختلف خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے اتنے میں پھر گھنٹی بڑے زور سے بجی۔

اس نے ہنستے ہوئے ماما کا خیر مقدم کیا اور بولا "بہتر ہو گا کہ تم پولس کو بلا لاؤ کیونکہ میں نے تمہارا مالک کو قتل کر دیا ہے۔"

مقصد حیات

(جارج مور۔ ۱۸۵۷ء)

مور ۱۸۵۷ء کو کونٹی میو آئیرلینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بڑا حصہ خود اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ۱۸۷۲ء میں فن مصوری کی تحصیل کے لئے پیرس گیا۔ جہاں اس کی ملاقات زولا۔ پاتی سمبالسن اور گانگوریس سے ہوئی۔ اس ملاقات سے اس کے خیالات میں تغیر عظیم پیدا ہوا۔ اور وہ مصوری چھوڑ کر ادب کی جانب متوجہ ہو گیا اس نے کئی کامیاب ناول لکھے۔ اس کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ۱۹۰۳ء میں "دے کاشت مزرعہ" کے نام سے شایع ہوا۔

ذیل کا قصہ مذکورہ بالا کتاب کے بہترین افسانوں میں سے ہے اس کو جناب

محمد محی الدین صاحب نے اردو میں منتقل کیا۔

تیس سال ایڈورڈ ڈمپسی کوین اور روی کے کارخانہ میں منشی گری کی ادنی درجہ کی ملازمت نہایت خوبی سے انجام دیتا رہا۔ اس کی پیدائش کا مقصد ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک مشین کی طرح۔ اور اسی یکسانیت سے کام کرے اس میں کسی قسم کی تبدیلی اب تک رونما نہیں ہوئی تھی۔ کارخانہ کے مینیجر اس عادت کے بندہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتے اور خاموش ہو جاتے۔ کئی نئے سرپرست کارخانہ میں آئے مگر ڈمپسی پر اس کا اثر نہ پڑا اسے ان تبدیلیوں سے کسی قسم کی دلچسپی نہ تھی اپنے کام سے کام تھا تنگ دریچہ کے پاس اس کی میز پڑی رہتی جس پر متعدد قلم۔ سرخ و سیاہ روشنائیاں۔ مسطر جاذب کے تختے ہمیشہ اسی طرح جمے رہتے جیسے کہ اس کی ملازمت کی ابتدا کے وقت تھے ڈمپسی دفتر میں سب سے اول آتا اور سب کے بعد جاتا تیس سال کے طویل عرصہ میں اس نے صرف ایک دن رخصت حاصل کی تھی۔ اس دن دوسرے کلرکوں میں اسی کا چرچا رہا۔ تاہم اس دن بھی ڈمپسی تمام دن غیر حاضر نہ رہ سکا بلکہ دوپہر میں وہ یہ کہتے ہوئے دفتر میں آیا کہ صبح سے اب تک غیر حاضر رہنے سے اسے اپنے ساتھیوں کو دیکھنے کی خواہش ہوئی اور وہ چلا آیا ڈمپسی ایک پستہ قد دبلا پتلا آدمی تھا۔ زندگی کی وسیع فضا میں اسے صرف اتنا عرصہ درکار تھا کہ وہ اپنی میز کے پاس بیٹھا ہوا کاغذ کے تختے سیاہ کرتا رہے مخروطی سر ایک طرف جھکائے ہوئے وہ انسانی ہستی کی بے مائگی کی زندہ تصویر دکھائی دیتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈمپسی کو اس کے سوا اور کوئی خواہش نہیں ہے کہ بغیر ایک کوٹھی کرتی ہر میز سے لگائے اسٹھار ہے اور لکھتا جائے

مسلسل اس کی یہ معمولی سی خواہش پوری بھی ہو جاتی۔ مگر ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جو اس میں تبدیلی کا باعث ہوا۔ بالکل اچانک وہ اس کی باقاعدہ منضبط اور غیر متاثر زندگی کے اندر داخل ہو گیا۔

موسم گرما میں ایک دن جب کہ فضاء کی گرمی کھلی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ ڈسپی کو نازک۔ ہلکی سی خوشبو محسوس ہوئی پہلے تو وہ پہچان نہ سکا کہ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ مگر بعد میں اس نے معلوم کیا کہ وہ چیکوں کے بنڈل سے آ رہی ہے جن کو وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے ہلکے گلابی رنگ کا ایک معطر چیک ان کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ بیس سال سے اسے کسی پھول کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہ تمیز نہ کر سکا کہ خوشبو چنبیلی کی ہے یا موتیا کی یا کسی اور پھول کی۔؟ لیکن اسی وقت چیک طلب کئے گئے۔ یہ اس نے اپنے بالا دست افسر کے حوالہ کر دئے اور پھر ان منتشر خیالات کو دماغ سے دور کر کے بنک کے وقت کے اختتام تک رجسٹروں میں حساب لکھتا رہا۔

لیکن رات کو جب وہ سونے لگا تو اسی ہلکی سی خوشبو کی دلخوش کن یاد اسے دوبارہ آئی۔ وہ تعجب کرنے لگا۔ چیک کس کا تھا؟ سنجھل کے نہ پڑھنے پر افسوس کرنے لگا۔ اس کے بعد اکثر حساب درج کرتے کرتے وہ اچانک اسی فکر میں ڈوب جاتا کہ وہ خوشبو گلاب کی تھی یا یاسمن کی گلاب کی نہ تھی اسے اتنا یقین تھا۔ بھولے ہوئے خواب اور عہد گزشتہ کی یادگاریں اس کے دماغ میں بھرنے لگیں امید کی ایک ہلکی سی جھلک اس کے دل میں پیدا ہوئی جس طرح سمندر کی گہرائیوں سے کوئی ڈوبی ہوئی چیز دفعتاً ابھر آتی ہے۔ ایسی آرزوئیں جو یا تو کبھی پیدا ہی نہ ہوئی تھیں یا اگر ہوئی بھی تھیں تو انہیں قطعی بھلا چکا تھا۔ وہ اسے اب پھر اپنا جلوہ دکھانے لگیں۔ ... اپنی گمشدہ ...

مسلسل گمنامی کی قابل نفرت زندگی سے خود متنفر ہو گیا۔ اور اس کے دل میں آرزوؤں کی لہریں اٹھنے لگیں

پھر وہی میٹھی خوشبو آئی جسے اب وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یاسمن کی تھی۔ اس کا دل امیدوں سے پھر لبریز ہو گیا اور ایک خوشگوار میٹھا سا درد اس کے قلب میں محسوس ہونے لگا۔ اس نے چک کو بڑی مشکل کے بعد ڈھونڈھ نکالا اور پل جانے کے بعد آنکھوں سے لگایا لبوں سے مس کیا۔ چک کی طرز تحریر زنانہ تھی۔ نازک خوشنما خط میں "ہنریٹا براؤن" کے دستخط تھے نہایت ہی دلکش۔ ڈمبسی کا منتشر دماغ گوناگوں آوازوں کا مرجع بن گیا۔ حساب لکھتے لکھتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ اسے ایک موہوم سی تصویر حسین ترین جیسے مجسم بہار اپنے سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ باہر آسمان پر دوڑتے ہوئے بادلوں کا عکس تھا یا واقعی کوئی اس کی نظر کے سامنے تھا ڈمبسی نے غور کرنا شروع کیا۔ ڈمبسی کی یہ پریشان خیالی اور مضطرب دماغی اس کے ساتھیوں کی نظر سے چھپ نہ سکی۔ سبھوں نے اسے دیکھا اور تعجب سے چہ میگوئیاں کرنے لگے

عمر بھر میں آج پہلی مرتبہ اسے دفتر کے بند ہونے پر خوشی ہوئی وہ تنہا رہنا چاہتا تھا تاکہ اپنے خیالات کی ایک علیحدہ دنیا بسائے اور اس میں فنا ہو جائے۔ ہنریٹا براؤن! یہ نام کچھ بھولے ہوئے نغمہ کی طرح اس کے دماغ میں باقی تھا۔ اس کی خوبصورتی کا اندازہ لگانے کی غرض سے وہ دوکانوں کے شیشوں پر لگی ہوئی تصاویر کو دیکھنے ٹھہر جاتا۔ مگر اس کے تخیلی حسن کی مطابقت ان میں سے ایک بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کی صحیح تصویر ڈمبسی صرف اسوقت کھینچ سکتا تھا جب کہ وہ اپنے آپ کو اس مادی دنیا سے دور ہٹا کے

معطر جملوں کی خوشبو کی تحلیل کے لئے متوجہ کرتا۔ چر چند منٹ کے خاتمہ پر ہنریٹا براؤن کا دستخطی چیک وصول ہوتا۔ اور چند لمحوں کے لئے منشی اپنے دل کی تنہا اور ساکت دنیا میں چلا جاتا۔

صرف یہی ایک خیال اس کے دماغ میں بسا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ہنریٹا براؤن جوان ہے یا بوڑھی خوبصورت ہے یا بدشکل۔ شادی شدہ ہے یا کنواری۔ صرف اس کا نام اور خوشبو اس کے لئے کافی تھی۔ اور یہ خیال اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ یہ مسرت و نعمت کا نورانی خیال ہے جو ہر انسان کو وراثتاً حاصل ہوتا ہے۔ مگر جسے اپنی انتہک محنت سے اب تک ڈمبی نے اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دیا تھا۔

اپنی ماں کی زندگی میں قلیل تنخواہ سے کفایت شعاری کر کے کچھ بچانا ڈمبی کے لئے دشوار تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد سے اس نے ایک سو پچاس پونڈ کی رقم اب تک بچائی تھی۔ اس خیال پر اسے خوف اور تعجب ہوتا کہ وہ اتنی بڑی رقم کا مالک ہے۔ اور سوچتا کہ وظیفہ ملنے سے قبل اس کے پاس کتنا روپیہ جمع ہو جائیگا اور آیندہ کام آ سکیگا۔ اس جمع شدہ رقم سے ایک پائی بھی نکالنا اسے گناہ عظیم معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب اس نے ہنریٹا براؤن کو جس کا پتہ اس نے بنک کے رجسٹر سے پا لیا تھا۔ بیس پونڈ کا ایک قیمتی بروچ بھیجنے میں لمحہ بھر بھی پس و پیش نہ کیا۔ اس نے چٹھی میں اپنا نام نہ لکھا۔ اور ایک عرصہ دراز تک اس خیال سے مطمئن رہا کہ اس کی محبوبہ نام اس کی بھیجی ہوئی چیز اپنے سینہ سے لگا رہی ہے۔ وہ چیز جسے اس کی انگلیوں نے مس کیا تھا۔ اب ہنریٹا کے سینہ سے مس ہو رہی ہے۔

ڈمبی رات دن اسی کے تصور میں محو رہتا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے فرائض میں غفلت برتنی شروع کی۔ حیرت زدہ منیجر نے کئی مرتبہ

تنبیہ بھی کی۔ یہ تبدیلی اس قدر تھی کہ دفتر کے دوسرے ملازموں کا بہترین موضوع بنی رہتی۔ مگر ڈیسی نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اور مستقل مزاجی سے جادہ عشق کی گامزنی کرتا رہا۔ وصال کی خواہش روز بروز غالب ہوتی گئی۔ اسی الجھن میں اس نے ایک خط کے ذریعہ اپنا حال دل اپنی معشوقہ کو مفصل طور پر لکھ بھیجا۔ جس میں اپنی اس نار و اجرات کی معافی طلب کرنے کے بجائے اسے مناسب اور جائز ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ خط کی عبارت سے نگریمی جذبات سے پر تھی وفور شوق جا بجا جھلکتا تھا۔

جواب ایک ہدایت کے ساتھ وصول ہوا کہ خط و کتابت فوراً بند کی جائے ورنہ اس کی اطلاع بنک سے منیجر کو کی جائے گی۔ مگر اس کا عشق کارگر نہ تھا۔ جوں جوں دن گذرتے گئے محبت کا خیال اس کے دل میں راسخ ہوتا گیا۔ ہدایت کے باوجود اس نے تحائف کا بھیجنا بند نہ کیا اور جب یہ واپس آ جاتے تو انہیں بے احتیاطی اور لاپرواہی سے ادھر ادھر ڈال دیتا۔ اور پھر اسی شوق و ذوق کے ساتھ نئے تحائف کی خریداری میں مصروف ہو جاتا۔ قسم قسم کے زیورات اور طویل خط بھرے وہ برابر روانہ کرتا رہا۔

ایک دن وہ منیجر کے کمرہ میں بلایا گیا۔ اور سخت سرزنش کے بعد اسکی قدیم وفادارانہ خدمات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا قصور معاف کر دیا گیا اس کے جرم عشق کے لئے سزا بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور اس نے نامہ و پیغام کا سلسلہ منقطع نہ کیا۔ اب اسے شہرت و رسوائی کی بھی پرواہ نہ تھی۔ کارخانہ کے مالکوں کو سخت تعجب ہوا۔ ان کو ڈیسی سے ایسی امید نہ تھی مگر اب اس کو کارخانہ سے علیحدہ کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تعجب پہ تعجب یہ کہ ڈیسی پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ برطرفی کا حکم سنکر مسکرایا اور بنک سے اس طرح رخصت ہوا جیسے پنجرہ سے چھوٹا ہوا پرندہ۔

اپنی معشوقہ کے تصور کے سوا دوسری باتوں پر دلچسپی [illegible] تھی - اس نے
اپنے آیندہ اخلاص و بیدکاری کا بھی خیال نہ کیا - اور نہ اسے واپس شدہ
زیورات بیچ کر روپیہ فراہم کرنے کی سدھ تھی - وہ ایڈنبرا تک کیسے پہونچے
اسے فکر تھی (اس کی معشوقہ کا مکان ایڈنبرا میں تھا) وہ وہاں صرف
پہونچنا چاہتا تھا - وسائل سے اسے بحث نہ تھی وہاں وہ اس کے تصور میں
محو شہر کی گلیاں پاپیادہ چھاننے پر قانع رہا - شاید کہ کبھی اس کی محبوبہ کا
حسین چہرہ اسے نظر آجائے! اسی طرح چکر لگاتے ہوئے اپنی حالت سے
بے خبر - مجنوں کی طرح وہ ڈبلن کے مضافات میں پھرتا رہا -

ایک گاؤں میں سے گذرتے ہوئے اسے تکان معلوم ہوئی - وہ
ایک سرائے میں گھس گیا اور آتش شکم کو فرو کرنے کے لئے روٹی اور
مکھن طلب کیا -

"آپ غالباً کہیں دور دراز سے آرہے ہیں؟"

ان دو آدمیوں میں سے ایک نے پوچھا جو بازو کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے
"بڑی دور جارہا ہوں" ڈیسی نے جواب دیا - "شمال کی جانب بڑی دور"
"مقصد؟"

"میں اپنی محبوبہ سے ملنے جارہا ہوں جسے بیش قیمت زیورات تحائف
میں پیش کروں گا -" دونوں نے آپس میں ایک معنی خیز اشارہ کیا
ایسے بھولے انسان کو ٹھگنا نہایت آسان کام تھا - ان شریروں
نے تحائف کو پرکھوانے کا حیلہ کرکے زیور اس سے مانگ لئے اور چمپت ہوئے
تھوڑی دیر تو ڈیسی انتظار کرتا رہا - آخر کار روٹی اور مکھن کی قیمت ادا
کرنے کے بعد ان کی تلاش کے لئے نکلا - مگر یہاں بھی [illegible] کا خیال
چوروں کی تلاش کے خیال پر غالب آگیا - اور پھر اس کا دماغ اپنی
معشوقہ کے سوائے اور کسی چیز کی طرف نہ [illegible] ثابت ہوا

وہ کئی دن تک گھومتا رہا۔ راہرو اگر اسے بھکاری سمجھ کر کچھ دیدیتے یا رحم دل اسے کھلا پلا دیتے تو وہ کھا لیتا ورنہ یونہی بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا۔ آخر کار اسے روٹی مانگنے کی بھی سدھ نہ رہی

موسم گرما کی ایک شب وہ خراب و خستہ سڑک کے کنارہ سو گیا آخری نیند وہ گھاس پر بے بس پڑا پڑا ۔ چمکتے ہوئے تاروں کو تک رہا تھا۔ دنیا کی ہر چیز اسے مدہم دکھائی دے رہی تھی جیسے دور کا منظر۔ نزع کے کیوقت جب اس کی آنکھیں آخری بار کھلیں تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک حسین ستارہ آسمان سے اتر رہا ہے اور آہستہ آہستہ نیچے آ کر اپنے درخشاں چہرہ کو اس کے سینہ پر رکھ کر محو خواب ہو گیا ہے۔

خوشدل شہزادہ

آسکر وائلڈ ۱۸۵۶ء - ۱۹۰۰ء

"آسکر وائلڈ انگریزی ادبیات کی غیر فانی شخصیت ہے اس نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ سے ادبیات کا شوق ہوا۔ اس کی پہلی مشہور نظم "راونیا" پر اس کو نیو ڈی گیٹ پرائز عطا کیا گیا تھا۔ مختصر قصوں کے علاوہ اس نے کئی ڈرامے اور نظمیں بھی لکھیں۔ جس سے اکثر انگریزی ادب کی جان ہیں۔ اس کی باغی فطرت اور جدت ہر کارنامہ میں نمایاں ہے، اسی نے اس کو بعض مشکلات میں ڈالدیا تھا۔ وائلڈ کا انتقال پیرس میں ہوا۔ جہاں وہ قید سے چھوٹنے کے بعد تکلیف کی زندگی بسر کر رہا تھا۔"

"ذیل کے قصے کا ترجمہ فیض محمد صاحب صدیقی بی اے کا ہے"

شہر سے دور ایک اونچے مقام پر خوشدل شہزادہ کا ایک مجسمہ بنایا گیا تھا۔ جس کے تمام جسم پر سونے کا مہین پتر منڈھا ہوا تھا۔ آنکھوں کی بجائے دو درخشاں اور خوبصورت نیلم جڑ دئیے گئے تھے اور اس کی تلوار کے دستہ پر

ایک منور لعل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔

لوگ اس کو بہت ہی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے شہر کی قونصل کے ایک رکن نے اپنے مذاق لطیف کو شہرت دینے کے لئے لوگوں کے سامنے اس کے متعلق یہاں تک کہا تھا کہ ہاں یہ مجسمہ مرغ باد نما سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن پھر اس خوف سے کہ کہیں لوگ بے عمل اور بیکار آدمی نہ تصور کرنے لگیں وہ کہنے لگا یہ سب کچھ ہے مگر اس سے ملک کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟"

ایک دفعہ چاند کو دیکھ کر ایک بچہ رونے اور ضد کرنے لگا اس پر اس کی ماں نے نہایت حسرت آمیز لہجہ میں کہا "کاش تو خوشدل شہزادہ کی طرح ہوتا! دیکھ وہ کسی بات پر ضد نہیں کرتا!"

اس عجیب و غریب مجسمہ کو دیکھ کر ایک غریب اور دل شکستہ آدمی نے کہا "میں خوش ہوں کہ دنیا میں ایک شخص اتنا خوشدل بھی گذرا ہے۔"

گرجا گھر کے یتیم بچے سفید پوشاک پہنے ہوئے گھر واپس لوٹتے وقت اکثر کہا کرتے تھے کہ "آہا! یہ تو فرشتہ معلوم ہوتا ہے!"

اس پر ریاضی کا استاد چیں بجبیں ہو کر پوچھتا "یہ تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ یہ فرشتہ ہے؟ کیا تم نے کبھی فرشتہ کو دیکھا ہے؟"

بچے جواب دیتے "ہاں ہم نے فرشتہ کو خواب میں دیکھا ہے" اس پر ریاضی کا استاد بہت خفا ہوتا تھا، اس لئے کہ وہ بچوں کے خواب کا قائل نہیں تھا۔

ایک رات اس شہر پر سے ایک ابابیل کا گذر ہوا اس کے دوست احباب اور خویش و اقارب ایک ہفتہ قبل ہی مصر کو روانہ ہو گئے تھے یہ خود بھی ان کے ہمراہ چلی جاتی لیکن اس نے کہ دام محبت میں گرفتار ہو کر

وہ پیچھے چھوٹ گئی۔ اس سے پہلی ملاقات اس طرح ہوئی تھی کہ وہ بہار کے موسم میں ایک روز ندی کنارے ہوا کھا رہی تھی کہ یکایک دریائی نیئے پر اس کی نظر پڑی۔ اس کا خوبصورت جسم اس کی نظروں میں کھچ گیا اور وہ اس پر عاشق ہو گئی۔ وہ ٹھہری اور اس سے عشق و محبت کی گفتگو کرنے لگی۔

ابابیل بہت دیر تک اپنے دلی جذبات کو چھپا نہ سکی۔ کہنے لگی کیا میں تم سے محبت کر سکتی ہوں؟" اسپر تنگے نے سر نیاز خم کیا "ہاں مجھے منظور ہے یا پھر کیا تھا۔ ابابیل اس کے ہزار جان سے صدقہ ہونے لگی۔ کبھی ہوا میں چکر لگاتی کبھی نیچے آکر ندی کے پانی میں اپنے پروں سے لہریں پیدا کرتی یہ اس کے عشق کا اظہار تھا جس کا سلسلہ تمام گرما جاری رہا۔

جب سب ساتھی رخصت ہو گئے تو ابابیل تنہا رہ گئی۔ اس حالت میں وہ اپنے معشوق کے متعلق خیال کرنے لگی "وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا شاید اس میں کوئی گھات ہے۔ جب ہوا چلتی ہے وہ مست ہو کر جھومنے لگتا ہے۔ مگر جب میں قریب جاتی ہوں تو مجھ سے کچھ نہیں بولتا شک آتا تھا کہ اس کے دل میں ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی۔ وہ کہنے لگی میں خانہ بدوش ہوں اس لئے ضرورت ہے کہ میرا ساتھی بھی خانہ بدوش ہو وہ تو ایک ہی جگہ رہتا ہے اس لئے اس کا میرا نباہ مشکل ہے۔

اس کے بعد ابابیل نے نئے سے سوال کیا "کیا تم میرے ہمراہ چلنا پسند کرتے ہو؟" نئے نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ وہ اپنے وطن کی محبت میں گرفتار تھا۔

خیر تم نے مجھے دھوکا دیا میں کبھی کی مصر کے اہرام تک پہنچ گئی ہوتی یہ کہکر ابابیل اڑ گئی اور تمام دن اڑتی رہی شام ہوتے ہوتے آستے کھمبر نظر دکھائی دیا جس کو دیکھکر وہ اپنے دل میں سوچنے لگی۔ اب مجھے رات کو

کسی جگہ بسیرا کرنا چاہیئے۔ امید ہے کہ شہر میں کوئی جگہ مل جائے گی
اتفاق سے اس کی نظر خوشدل شہزادے کے مجسمہ پر پڑی۔ اس کو دیکھ کر وہ دل میں خوش ہو گئی "ہاں مجھے رات اسی جگہ بسر کرنی چاہیئے یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ علاوہ اس کے یہاں مجھے صاف ہوا بھی میسر آئے گی" ابابیل نیچے اتر آئی۔ اور خوشدل شہزادہ کے قدموں کے درمیانی حصہ میں پڑ رہی۔ چار طرف نظر ڈالنے کے بعد وہ کہنے لگی "آہا آج میرے آرام کے لئے سونے کا بستر ہے" وہ ابھی آرام کرنے کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ یکایک پانی کا ایک بڑا سا قطرہ اس کے سر اور پروں پر گرا۔ وہ حیران ہو گئی۔ "یہ عجیب بات ہے مطلع صاف ہے اور آسمان پر نام کو بادل نہیں مگر پھر بھی بارش ہو رہی ہے حقیقت میں شمالی یورپ کا موسم بڑا خوفناک ہوتا ہے سنبے بھی بارش کو بہت پسند کرتی ہے ہاں اس کی خود غرضی ہے"۔

اسی اثناء میں دوسرا قطرہ گرا۔

وہ جھلا کر کہنے لگی۔ "ایسے مجسمہ سے کیا فائدہ جب کہ اس میں بارش بھی رکتی نہیں اب مجھے کوئی آتش دان تلاش کر کے اس کے بالائی حصہ میں بسیرا کرنا چاہیئے۔ اس ارادہ سے اڑنے کو تھی کہ تیسرا قطرہ اس کے سر اور پروں پر گرا وہ اوپر کی طرف دیکھنے لگی۔ آہ اس نے کیا دیکھا۔

خوشدل شہزادہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا رواں تھا جو سنہری رخساروں سے سیلاب کی طرح بہ رہا تھا۔ چاندنی روشنی میں اس کا خوبصورت چہرہ ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا اس کو دیکھ کر ابابیل کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

اس نے دریافت کیا "تم کون ہو"؟

"میں خوشدل شہزادہ ہوں"

"پھر اس قدر تم رو کیوں رہے ہو تم تو آنسا رو ئے کہ میں بھیگ گئی"۔
مجسمہ نے جواب دیا۔ جب میں زندہ تھا اور میرے اندر ایک انسانی دل بھی تھا میں آنسوؤں کی حقیقت سے قطعاً نا آشنا تھا اس لئے کہ میری بود و باش ایک ایسے محل میں تھی جہاں غم کا گزر نہ تھا دن کا وقت میں اپنے ہمجولیوں کی صحبت میں گذارتا اور رات بڑے محل میں رقص و سرود کی محفلوں کا لطف اٹھاتا میرے باغ کے اطراف میں ایک اونچی دیوار تھی لیکن میں نے کبھی یہ دیکھنے اور معلوم کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ اس کے پیچھے کیا ہے؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میرے اطراف میں ایک سے ایک زیادہ خوبصورت چیزیں موجود تھیں۔ میرے درباری مجھے خوش دل شہزادہ کے نام سے یاد کرتے تھے اور در حقیقت میں خوشدل تھا بھی اگر عیش و عشرت کو خوش دلی یا مسرت کہا جائے اسی طرح میں نے دنیا میں زندگی بسر کی اور رحصت بھی ہو گیا میرے مرنے کے بعد مجھے اس اونچے مقام پر کھڑا کیا گیا ہے جہاں سے میں اپنے شہر والوں کی تکالیف کا اچھی طرح مشاہدہ کر سکتا ہوں۔ اس وقت اگرچہ میرا دل سیسے کا ہے مگر اپنے وطن والوں کو مصیبت کا شکار ہوتا دیکھ کر وہ موم کی طرح پگھلا جا رہا ہے۔ اب میرے لئے سوائے افسوس کے آنسو بہانے کے اور کیا چارہ ہے۔
ابابیل نے اپنے دل میں کہا۔ تو کیا یہ مجسمہ ٹھوس سونے کا نہیں ہے اس کے دل میں یہ شک گذرا۔ مگر اظہار ہمدردی کی خاطر اس نے اس پر شخصی طور سے کوئی حملہ کرنا گوارا نہ کیا۔
مجسمہ نے نہایت ترنم آمیز لہجہ میں کہا "یہاں سے کسی قدر فاصلہ پر ایک گلی میں غریبوں کا ایک جھونپڑا ہے جس کے اندر ایک عورت اپنی میز کے پاس بیٹھی کچھ سی رہی ہے۔ اس کا چہرہ پژمردہ اور دل غمزدہ ہے اس کے دونوں ہاتھ کی ہتھیلیاں سوئیوں کے چبھنے کی وجہ سے سرخ ہو گئی ہیں

وہ ایک وزن ہے اور ملکہ کی ایک سہیلی کی پوشاک پر زر دوزی کا کام کر رہی ہے۔ کمرہ کے ایک گوشہ میں اس کا بیمار بچہ بخار اور پیاس کی وجہ سے بلبلا رہا ہے۔ اس کی ماں کے پاس ندی کے پانی کے سوا اور کیا ہے۔ وہ رو رہا ہے۔ ابابیل ابابیل اے چھوٹی ابابیل! کیا تو اس لعل کو جو میری تلوار کے دستہ میں جڑا ہوا ہے اس تک پہنچا سکتی ہے۔ کیونکہ میرے پیر کٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے میں حرکت نہیں کر سکتا۔

ابابیل نے کہا مصر میں میرا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ میرے ساتھی دریائے نیل پر جشن منا رہے ہوں گے اور بسیرے کے بعد وہ بادشاہی گنبد میں جا بیٹھیں گے۔ غرض عیش و طرب کے جلسے ہوں گے میرا وہاں جانا ضروری ہے۔

شہزادہ نے مایوسانہ انداز میں کہا "ابابیل، ابابیل۔ اے چھوٹی ابابیل کیا تو یہاں ایک رات ٹھہر کر میری پیغام رسانی نہیں کر سکتی دیکھ اس چھوٹے بچے کا پیاس کے مارے برا حال ہو رہا ہے اور اس کی مفلس ماں غمگین ہے"

ابابیل نے جواب دیا "میں بچوں کو پسند نہیں کرتی۔ اس لئے کہ گزشتہ گرما میں ایک روز میں دریا کے کنارے ٹھہری ہوئی تھی کہ گرجی والے کے دو شریر بچوں نے مجھ پر پتھر پھینکنا شروع کیا۔ اگرچہ میں ان کی زد سے بچ گئی کیونکہ ہم ابابیلیں ان کا بچاؤ نہایت آسانی سے کر لیتی ہیں اور پھر میں تو اس خاندان کی ایک رکن ہوں جو اپنی چستی اور چالاکی کے باعث بے انتہا مشہور ہے تاہم ہم پر پتھر پھینکنا ہماری علانیہ توہین ہے کہ نہیں؟"

لیکن شہزادہ کی مایوسی کو دیکھ کر اس کا دل متاثر ہوا وہ کہنے لگی "اچھا اگرچہ اس وقت یہاں بےحد سردی پڑ رہی ہے تاہم میں یہاں ایک رات ٹھہر کر تمہاری پیغامبر بنوں گی۔"

شہزادے نے ابابیل کا شکریہ ادا کیا۔

ابابیل نے تلوار کے دستے سے لعل کو نکال لیا اور اسے چونچ میں

لیکر شہر کے مکانوں کی چھتوں پر اڑنے لگی۔

جب وہ گرجا گھر پر سے گذری تو فرشتوں کے مرمریں مجسمے دکھائی دیئے محلوں کے قریب سے گذری تو رقص و سرود کی صدائیں اس کے کانوں میں آنے لگیں کسی مکان کے بالاخانہ پر اس نے دیکھا کہ ایک دوشیزہ اپنے عاشق سے محو گفتگو ہے عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا "آسمان پر تارے کس شان سے چمک رہے ہیں! محبت کی صداؤں میں بھی اسی قسم کی شان ہے"

اس کی محبوبہ نے کہا "میرے خیال میں لباس شاہی مجلس رقص کے انعقاد سے قبل ہی تیار ہو جائیگا۔ میں نے اپنی پوشاک کو زریں پھول کاڑھنے کے لئے درزن کے ہاں بھیجا ہے۔ مگر درزن کمبخت بڑی سست ہے"۔

سمندر میں جہازوں کے مستولوں پر قندیلیں لٹک رہی تھیں یہودی لوگ بازار میں لین دین کر رہے تھے۔ ان تمام مناظر کا سرسری مطالعہ کرتے ہوئے ابابیل جھونپڑے کے قریب جا پہنچی اور اندر داخل ہو گئی یہاں بچہ بخار کی شدت سے اپنے بستر پر بلبلا رہا تھا اور ماں بچاری تھکی ماندی ذرا سو گئی تھی

ابابیل نے اس عورت کی میز پر وہ لعل رکھدیا اس کے بعد بچہ کی پیشانی کو اپنے پروں سے ہوا دیتے ہوئے بستر کے اطراف میں اڑنے لگی۔ بچہ نے کہا او ہو مجھے کس قدر سردی ہو رہی ہے۔ شاید میرا بخار اتر رہا ہے۔ یہ کہکر وہ میٹھی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ابابیل نے شہزادہ کے سامنے سارے واقعات من وعن بیان کر دئے اس کے بعد وہ کہنے لگی مجھے تعجب ہے کہ باوجود اس قدر سردی کے میرے جسم میں اب گرمی آگئی ہے۔

شہزادہ نے جواب دیا "اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم نے ابھی ایک نیک کام انجام دیا ہے۔ یہ نیکی کی گرمی ہے"۔

ابابیل اس بات کو سوچتے سوچتے سو گئی۔ کیونکہ کسی بات پر زیادہ توجہ دینے سے نیند آجاتی ہے۔

دن نکلنے کے بعد دریا پر اس نے اشنان کیا۔ ابابیل کو دیکھ کر حیاتیات کے پروفیسر کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ وہ کہنے لگا کیسی عجیب بات ہے کہ سرما کے زمانہ میں ابابیل نظر آ رہی ہے! اس کے متعلق مضامین لکھ کر اس نے مقامی اخبارات کے ہنسنے کے صفحے سیاہ کر دئیے۔ اکثر لوگوں نے اس کے جملوں کا حوالہ بھی دیا ہے کیونکہ خطوں میں غیر مانوس الفاظ کی کثرت تھی جن کا سمجھنا عوام کے لیے مشکل کیا غیر ممکن تھا۔

آج رات میں مصر روانہ ہو جاؤں گی۔ ابابیل نے یہ مصمم ارادہ کر لیا اور تمام یادگاروں کی زیارت کرنے کے لیے روانہ ہو گئی۔ کبھی اس عمارت کو دیکھا کبھی اس کھنڈر کا معائنہ کیا کچھ دیر گرجا کی چوٹی پر جا بیٹھی۔ غرض سارا دن اس طرح سے گذار دیا۔ اور شام کو کہ جب تخت آسمان پر ماہ منور جلوہ افروز ہوا وہ بھی شہزادہ کے پاس رخصت لینے واپس آئی۔ کہنے لگی کیا مصر میں بھی تمہارا کوئی کام ہے میں اب وہاں جا رہی ہوں۔

شہزادہ نے کہا "ابابیل، ابابیل۔ اے چھوٹی ابابیل! کیا تو ایک رات اور میرے ساتھ نہیں ٹھہر سکتی؟"

ابابیل نے جواب دیا "مصر میں میرا ساتھی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے کل میرے تمام ساتھی دوسرے آبشار کو روانہ ہو جائیں گے۔ جہاں رعمسن دیو تخت مرمریں پر جلوہ افروز ہوگا۔ وہ تمام رات ستاروں کا نظارہ کرتا ہے اور صبح ہوتے ہوتے۔ خوشی کا ایک زبردست نعرہ مار کر خاموش ہو جاتا ہے دوپہر کے وقت شیر ببر دریا کے کنارے پانی پینے آتے ہیں۔ ان کی آنکھیں فیروزے کی مانند چمکتی رہتی ہیں۔ آبشاروں کی آواز ان کی گرج کے مقابلہ میں طوطی کی صدا معلوم ہوتی ہے۔"

شہزادہ نے کہا "ابابیل! اے ننھی ابابیل! یہاں سے کچھ فاصلے پر شہر میں ایک مکان ہے جس کے اندر ایک نوجوان میز پر سر رکھے اپنی

کرسی پر آزردہ صورت بنائے بیٹھا ہے۔ اس کے بال بھورے اور گھونگر والے ہیں۔ اس کے ہونٹھ سرخ اور اس کی آنکھیں مخمور ہیں۔ وہ تھیٹر کے لئے ایک ڈرامہ تصنیف کر رہا ہے۔ مگر سردی اور بھوک کے مارے اس کا حال برا ہو رہا ہے۔ آتش دان میں آگ موجود نہیں ہے اور نہ اس کے پاس کھانے ہی کو کچھ ہے۔ بھوک کے باعث اس میں نقاہت پیدا ہو چکی ہے۔

ابابیل رحم دل ابابیل نے رضامندی کے لہجہ میں کہا "میں ایک رات اور یہاں قیام کر دوں گی، کیا اس کو کوئی دوسرا لعل دے آؤں"

شہزادہ نے کہا "آہ اب کوئی لعل باقی نہ رہا۔ اب صرف میری آنکھوں کے دو نیلم باقی ہیں۔ ان میں سے ایک کو میری آنکھ سے نکالکر اس تک پہنچا دے وہ اس کو جوہری کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی ضروریات کی چیزیں خریدے گا اور آگ جلا کر اپنے کمرہ کو گرم کر سکیگا۔ اس کے بعد یقین ہے کہ وہ اپنی تصنیف ختم کر سکیگا۔"

"میرے پیارے! یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو گا!" یہ کہکر ابابیل رونے لگی

"ابابیل! ابابیل اے چھوٹی ابابیل جا اور میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہ کر"

ابابیل نے اس کی آنکھ کا ایک نیلم نکال لیا اور نوجوان کو دینے کے لئے روانہ ہو گئی۔ مکان میں داخل ہونے کے لئے کوئی دقت پیش نہ آئی اس لئے کہ کمرے کی دیوار میں ایک سوراخ تھا۔ جس کے ذریعہ سے وہ اندر داخل ہو گئی اندر جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ نوجوان کان پر ہاتھ رکھے اور میز پر کہنیوں کو سہارا دئے ایک گہری سوچ میں بیٹھا ہوا ہے۔ نوجوان اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کو نہ سن سکا۔ کیونکہ وہ اس قدر فکر مند تھا کہ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کون آیا اور کون گیا ابابیل نہایت آہستگی سے نیلم کو اس کی میز پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی میز پر بجائے سوکھے ٹکڑوں کے خوبصورت نیلم رکھا ہے

اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی وہ چلا اٹھا۔

"ہاں لوگ اب میری قدر کرنے لگے ہیں" یہ نیلم کسی صاحب ذوق کا عطیہ ہے۔ ہاں اب میں اپنی تصنیف ختم کر لوں گا۔

وہ بہت خوش تھا۔

دوسرے دن ابابیل ساحل پر گئی اور وہاں جہاز کے مستول پر بیٹھ کر ملاحوں اور قلیوں کا تماشا دیکھنے لگی کہ کس طرح مزدور اور حمال جوشیلی آوازیں نکال کر اپنے کام کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ ابابیل نے کہا۔ میں مصر کو روانہ ہو رہی ہوں لیکن کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی اس لئے جیسے ہی چاند نکلا وہ شہزادہ خوشدل کے پاس واپس گئی۔

"میں تمہیں خدا حافظ کہنے کے لئے آئی ہوں" ابابیل نے کہا۔

"ابابیل اچھی ابابیل! کیا تو ایک رات اور میرے ساتھ قیام نہیں کر سکتی؟"

ابابیل نے جواب دیا شہزادہ۔ یہ سرما کا زمانہ ہے کچھ دن بعد یہاں برف باری ہو گی۔ اس وقت میری زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی بر خلاف اس کے آج کل مصر میں گرمیوں کا موسم ہے۔ وہاں میرے تمام ساتھی بعلبک کے گنبد میں گھونسلا بنانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ اب تو میں جاتی ہوں لیکن عمر بھر تمہاری یاد کو دل سے نہ بھلاؤں گی۔ پیارے شہزادے اب کی بہار میں تم سے میں ضرور ملونگی اور تمہارے لئے ایک لعل قیمتی لاؤنگی جو گلاب کے پھول سے بھی زیادہ سرخ ہو گا۔ اور ایک نیلم لاؤں گی جس کا نیلا رنگ دریا کے رنگ کو بھی مات کرے گا"

خوشدل شہزادے نے کہا۔ "نیچے میدان میں دیا سلائی بیچنے والی ایک لڑکی کھڑی ہے اس کی سب ڈبیاں کسی گڈھے میں گر کر خراب ہو گئی ہیں ایسی حالت میں اگر وہ اپنے گھر جائے تو اس کا باپ اس کو سخت سزا دیگا۔ اسی وجہ سے وہ چلا رہی ہے۔ میری دوسری آنکھ نکالکر اسے دے جا کہ اس کا

روزآنہ ہیں پجاری اسے شہد اور مکھن کھلایا کرتے ہیں۔ پھر اس نے بونوں کی سرگزشت بیان کی کہ بونے بڑی بڑی جھیلوں کو پتوں پر بیٹھکر عبور کرتے ہیں۔ تیتریوں سے ہمیشہ ان کی جنگ ہوا کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے شہزادہ کے سامنے بیشمار چشم دید واقعات بیان کیے، جن کو شہزادہ نہایت خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔

اچھی ابابیل! میں تیرا ممنون ہوں کہ تونے مجھے ان تمام عجیب و غریب واقعات سے واقف کیا جو فی الحقیقت حیرت انگیز ہیں۔ لیکن یاد رکھ دنیا میں انسانی تکالیف سے زیادہ حیرت انگیز کوئی دوسری چیز نہیں ہے مصائب اور آلام کا راز دنیا کے سب رازوں سے زیادہ پوشیدہ ہے۔ چھوٹی ابابیل۔ جا اور تمام شہر کا گشت لگا کر اس کا سب حال میرے سامنے بیان کر۔

ابابیل شہر کا گشت کرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ امیر آدمی اپنے محلوں میں عیش کے جلسے منا رہے ہیں اور غریب ان کے دروازے پر پڑے ان کی ایک نظر کرم کے محتاج ہیں گلی کوچوں میں غریبوں کے بھوکے بچے نہایت حسرت سے ایک دوسرے کا منھ تک رہے ہیں۔ اسی اثناء میں اس نے دیکھا کہ پل کے نیچے دو چھوٹے لڑکے ایک دوسرے کو لپٹے ہوئے پڑے ہیں ایک نے دوسرے سے کہا "ہمیں کس قدر بھوک لگ رہی ہے" انہیں دیکھکر پل کے کانگراں لکارڈ ا ٹمنے لگا کہ یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ یہ ڈانٹ پڑتے ہی وہ بیچارے بھوکے بچے برستے پانی میں باہر نکل گئے۔

واپس آکر ابابیل نے ان تمام واقعات کو شہزادہ کے سامنے بیان کر دیا شہزادہ نے کہا "میرے جسم پر سونے کا پتر چڑھا ہوا ہے اس میں سے کچھ وہ نکال لے اور بچوں کو تقسیم کر دے زندہ انسان ہی سمجھتا ہے

باپ اسے سزا نہ دے۔

ابابیل نے کہا اچھا میں تمہارے ساتھ ایک رات یہاں اور ٹھہر سکتی ہوں مگر یہ تو مجھ سے ہرگز نہ ہوگا کہ تمہاری دوسری آنکھ بھی نکال لوں۔ کیونکہ تم خواہ مخواہ اندھے ہو جاؤ گے۔"

"ابابیل! اے رحمدل ابابیل! اچھا اور میرے حکم کی تعمیل میں دیر نہ کرو۔"

ابابیل نے اس کی دوسری آنکھ بھی نکال لی۔ پھر اس کو لیکر وہ نیچے اتر آئی اور دیا سلائی بیچنے والی لڑکی کے بازو سے گذرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں نیلم چھوڑ دیا۔ لڑکی خوش ہو گئی۔ کس قدر خوبصورت گلاس ہے۔ یہ کہکر وہ ہنستی ہنستے گھر پہنچی۔

ابابیل شہزادہ کے پاس آکر کہنے لگی۔ "اب چونکہ تم اندھے ہو گئے ہو اس لئے میں اب ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گی۔"

بیچارے شہزادہ نے کہا۔ "نہیں ابابیل تجھ کو مصر ضرور جانا چاہیئے۔"

"نہیں، میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔" یہ کہکر ابابیل شہزادہ کے قدموں پر سو گئی۔

دوسرے دن شہزادہ کے کندھوں پر بیٹھ کر اس نے مختلف مقامات کے چشم دید واقعات بیان کئے۔ مصر کی سرخ چڑیوں کے متعلق کہا کہ وہ کس طرح ایک قطار میں لب ساحل کھڑی ہو کر سنہری مچھلیوں کو اپنی چونچ سے پکڑتی ہیں۔ اس کے بعد وہ بیان کرنے لگی کہ اسفنکس ایک جانور ہوتا ہے جس کا چہرہ آدمی کا اور بدن شیر کا ہوتا ہے۔ اس کی عمر بہت بڑی ہوتی ہے اور دنیا کے ہر ایک واقعہ کو وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ مسافروں کے متعلق کہنے لگی کہ دوران سفر میں وہ لوگ اپنے اونٹ کے پاس وہ بازو تسبیح پھیرتے ہوئے نہایت متانت سے چلتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے اور بہت سے قصے بیان کئے۔ مثلاً ایک سانپ ہے جو کھجور کے درخت کے اندر سویا کرتا ہے،

کہ سونا انسان کو خوش رکھنے والی چیز ہے۔ مگر میرے لئے یہ بیکار ہی تھوڑا تھوڑا کر کے ابابیل نے شہزادہ کے جسم پر کا تمام سونا غریب بچوں میں تقسیم کر دیا شہزادہ کا جسم اب بالکل پھیکا اور بے رونق معلوم ہوتا تھا غریبوں کے بچے بارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔

دن رات کھیلتے کودتے اور خوشیاں مناتے تھے ان کے چہروں کا زردی مائل سفید رنگ اب پھر گلاب کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ خوشی میں آکر وہ کہتے تھے۔ "اب تو ہمارے پاس روٹی ہے"

تھوڑے دن بعد برف باری شروع ہو گئی تمام فضا کہر آلود ہو گئی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مکان پر چاندی کا پتر منڈھا ہوا ہے چھتوں کا ہو گر لوں پر برف کے تودے سے جم گئے شہر کی فضا میں لٹک رہے تھے ہر ایک شخص اونی لباس پہنے ہوئے تھا۔ چھوٹے بچے سرخ ٹوپیاں اوڑھ کر برف کی سطح پر اپنے دلچسپ کرتب دکھلا رہے تھے۔ سب اسی لطف میں شریک تھے لیکن بیچاری ابابیل کا سردی کے مارے برا حال ہو رہا تھا یہ سب کچھ تھا مگر وہ شہزادہ کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کو اس سے بے انتہا محبت ہو گئی تھی۔ جب زیادہ سردی ہونے لگی تو بھٹیارے کی دوکان پر پہنچی۔ یہاں پہنچکر اس نے کچھ ریزہ ٹکڑا ہضم کر لیا اور جسم کو گرمی پہنچانے کی خاطر اپنے پروں کو زور زور سے مارنے لگی۔ بدن میں گرمی آگئی۔ مگر پھر بھی اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اب زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتی ہمت کر کے وہ شہزادہ کے کندھوں پر جا بیٹھی اور آہستہ سے کہنے لگی "پیارے شہزادہ۔ خدا حافظ! کیا میں تمہارے ہاتھ کو بوسہ دے سکتی ہوں؟"

شہزادہ نے جواب دیا۔ "اچھا چھوٹی ابابیل میں خوش ہوں کہ تم مصر جا رہی ہو۔ یہاں تم نے اپنا بہت وقت صرف کیا لیکن بجائے

ہاتھ کو بوسہ دینے کے تو میرے ہونٹ کو بوسہ دے اس لئے کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔"

ابابیل نے کہا "میرا ارادہ مصر جانے کا نہیں ہے بلکہ میری روانگی عدم آباد کو ہے۔ موت اور نیند میں قریب کا رشتہ ہے کیوں کیا ایسا نہیں ہے؟"

اس کے بعد ابابیل نے خوشدل شہزادہ کے لب کا بوسہ لیا اور پھر اس کے قدموں پر گر پڑی۔

اسی وقت مجسمہ کے اندر سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی حقیقت میں خوشدل شہزادہ کا شیشہ کا دل دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑی سردی ہو رہی تھی۔

دوسرے دن علی الصبح شہر کا قاضی اور وزیر دونوں اس میدان میں تفریح کے لئے آئے اس طرف سے گذرتے وقت یکایک انکی نظر مجسمہ پر پڑی۔ وزیر نے کہا "ارے! شہزادہ خوشدل کس قدر بھونڈا معلوم ہو رہا ہے۔

وزیر جو ہمیشہ قاضی کی ہر بات پر ہاں کہتا تھا۔ کہنے لگا "ہاں فی الحقیقت بھونڈا دکھائی دیتا ہے۔" اس کے بعد دونوں اس کے دیکھنے کے لئے اوپر چڑھنے لگے۔

قاضی نے حیرت سے کہا "تلوار کے دستہ پر کا لعل غائب ہے آنکھوں کے نیلم کا بھی پتہ نہیں۔ اب تو اس کا جسم بھی سنہری نہیں رہا اب تو یہ ایک فقیر سے بھی زیادہ بدنما معلوم ہوتا ہے۔"

وزیر نے کہا "ہاں ہاں فقیر سے بھی بدتر ہے۔"

قاضی نے کہا دیکھو اس کے قدموں پر ایک مردہ پرندہ بھی پڑا ہے اب ہمیں اس قسم کا اعلان کرنا چاہئے کہ پرندوں کو کسی مقبول پر

عرصے کی سخت مخالفت ہے منشی نے ان تمام تجاویز کو قلمبند کر لیا۔
یونیورسٹی کے آرٹسٹ پروفیسر نے کہا "چونکہ اب یہ مجسمہ خوبصورت نہیں رہا اس لئے کارآمد بھی نہیں ہے" اس کے بعد خوشدل شہزادہ کا مجسمہ گرا دیا گیا۔

مجسمہ کو پگھلانے کے لئے بھٹی میں بھیجا گیا۔ اور ایک قاضی اسی تصفیہ کے لئے مقرر ہوا کہ اس دھات کا کیا کیا جائے اس نے کہا "اس کا مجسمہ تیار کرنا چاہیئے۔ بے شک وہ مجسمہ میرا ہوگا۔"

شہر کی مجلس اعلیٰ کے ہر رکن نے میرا ہونا چاہیئے! میرا ہونا چاہیئے کی صدائیں بلند کیں اور باقاعدہ تو تو میں میں ہونے لگی۔

ادھر ورک شاپ کا مہتمم حیران ہو کر کہنے لگا "عجیب بات ہے سیسہ کا ٹوٹا ہوا دل بھٹی میں پگھلتا ہی نہیں ہے۔ اس کو پھینک دینا چاہیئے" یہ کہکر اس نے اس کو کچرے کوڑے کے انبار میں پھکوا دیا جہاں مردہ ابابیل بھی پڑی ہوئی تھی۔

خدا نے اپنے فرشتے کو حکم دیا "جاؤ اور شہر سے میرے لئے دو ایسی چیزیں لاؤ جو سب سے زیادہ قیمتی ہوں" فرشتہ نے تعمیل حکم میں ایک تو سیسہ کا دل اور دوسرے مردہ پرندہ پیش کیا۔

خدا نے فرمایا "تمہارا انتخاب ٹھیک ہے۔ اچھا یہ مردہ پرندہ ہمیشہ کے لئے میرے باغ یعنی جنت میں نغمہ سرائی کریگا۔ اور یہ خوشدل شہزادہ میری شہری دنیا میں رہکر میری حمد و ثنا کیا کرے گا!"

بچپن

میمون

اڈیارڈ کپلنگ۔ ۱۸۶۵ء

کپلنگ جنوبی ہند کے شہر بمبئی میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جان لاک اڈ کپلنگ

مصوری میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس نے لاہور میں عرصہ تک عجائب خانہ کی خدمت انجام دی۔ رڈیارڈ کپلنگ نے انگلستان میں تعلیم پائی، اور ۱۷ سال کی عمر میں ہندوستان واپس ہو کر لاہور کے "سول اور ملٹری گزٹ" کے سب اڈیٹر کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء کی۔ شاعری اور قصہ نگاری میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ کپلنگ کے مختصر قصے اس کی زندگی کا بڑا سرمایہ ہیں۔ جدت طرازی، کردار کے تنوع، بیانات کے مکالموں کی خوبی اور فضا کی سحریت میں اس کے قصے قابل ہیں۔ سپاہیوں کے قصے لکھنے میں اس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔

بچیں۔ کپلنگ کے بہترین قصوں میں شمار ہوتا ہے جس کا ترجمہ عزیز احمد صاحب نے کیا ہے۔

کس کی زندگی مسرت سے لبریز ہے؟ اس کی جو مٹی میں لتھڑے ہوئے بچوں کو اپنے گھر میں کھیلتے کودتے گرتے اور روتے دیکھتا ہے۔ چوگان بازی کا گیند۔ پرانی اور اندر اور شکستہ تھی وہ اس صندوق پر رکھی ہوئی تھی جس میں حقے کے نیچے رکھے تھے۔ جن کو امام الدین خدمتگار میرے لئے صاف کر رہا تھا۔

"کیا حضور کو اس گیند کی ضرورت ہے؟" امام دین نے ادب سے کہا حضور کو اس کی ضرورت نہیں۔ مگر پولو کی گیند ایک بوڑھے خدمتگار کے کس کام کی ہے؟

حضور کے اقبال سے میرا ایک ذرا سا بچہ ہے۔ وہ اس گیند کو دیکھ چکا ہے۔ اور اس سے کھیلنا چاہتا ہے۔ میں اس کو اپنے لئے نہیں مانگتا۔ ہر شخص فوراً یہ ماننے کے لئے تیار تھا کہ بڈھا امام دین پولو بال سے خود کھیلنا نہیں چاہتا۔ میں نے اسے اجازت دیدی اور وہ اس از کار رفتہ گیند کو لے کر برآمدے میں نکل گیا۔ اور وہاں سے مسرت آمیز قہقہوں۔ ننھے ننھے پیروں کی دھمک اور گیند کی آواز کا شور اٹھا اس کا چھوٹا لڑکا اپنا خزانہ حاصل کرنے کے لئے باہر کھڑا تھا۔ اس پولو کے گیند کو دیکھ کر وہ کس قدر خوش ہوا

دوسرے دن وقعہ سے معمول سے ضعف گھنٹے پیشتر واپس

یہ تو سچ ہے کہ میرا نام کرم الدین ہے "تاہب" (صاحب) لیکن میں بدمعاش نہیں ہوں۔ میں ایک آدمی ہوں" اس دن سے مجھ سے اور کرم دین سے دوستی ہو گئی۔ اس کے بعد پھر کبھی وہ میرے کھانے کے کمرے میں نہیں آیا۔ مگر باغ میں ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت جوش سے ملتے تھے۔

باوجودیکہ ہمارے پیام و سلام صرف اس کی طرف سے "سلام تاہب" اور میری طرف سے "سلام کرم الدین" تک محدود تھے۔ روز دفتر سے واپسی کے وقت۔ بلیوں سے ڈھکے ہوئے دروازے کے سائے سے اٹھ کر چھوٹا فربہ جسم اور سفید کرتہ میرا استقبال کرتا اور میں اپنا گھوڑا وہاں روک لیا کرتا تھا کہ میرا پھیکا نہ معلوم ہو۔؟

کرم دین کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ وہ صحن اور ارنڈ کے جھاڑوں میں عجیب و غریب کھیل کھیلتا پھرتا تھا۔ ایک دن اتفاقاً اس کی دستکاری کے کھلونے پر میرا پیر پڑ گیا۔ اس نے نصف کے قریب پولو بال زمین میں گاڑ دیا تھا۔ اور گیندے کے چھ سوکھے ہوئے پھول اس کے اطراف ایک دائرے کی صورت میں لگا دئیے تھے۔ دائرے کی بیرونی جانب ایک خراب سے مربع اینٹ کے ٹکڑوں اور چینی کے ریزوں کا بنا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں مٹی کے ایک چھوٹے سے حصار سے گھری ہوئی تھیں خدا بہتر جانتا ہے ہرگز میرا ارادہ نہ تھا کہ لڑکے کے کھیل کو میں ہاتھ تک لگاؤں ایک شام کو سیر کرتے کرتے میں ادھر جا نکلا۔ قبل اس کے کہ میری نظر اس پر پڑے۔ میرا پیر پڑ گیا۔ گیندے کے پھول مٹی کا حصار اور ٹوٹی ہوئی صابن دانی کے ریزے اس قدر رل جل گئے کہ مجھے اس کی مرمت کا خیال چھوڑ دینا پڑا۔

دوسری صبح میں نے کرم الدین کو اپنی دستکاری کی بربادی پر

[illegible] پر میں نے کھانے کے کمرے میں ایک چھوٹی سی شکل کو دیکھا —
ایک چھوٹی اور فربہ شکل کو ایک [illegible] انگرکھا اور نامکمل کرتا پہنے ہوئے [illegible] گوشت پوست ہوئے تھا - وہ منہ میں انگوٹھا ڈالے ادھر ادھر پھر رہا تھی - اور تصویر والا کمال جس نے گنگنا رہی تھی - یقیناً وہ بڑا سا بچہ بھی شکل تھی -

درحقیقت اس کو میرے کمرے میں کوئی کام نہ تھا لیکن وہ اپنی تحقیقات میں اس درجہ مصروف تھا کہ اس نے دروازے کی طرف مجھکو نہ دیکھا - میں کمرے میں داخل ہوا - اور وہ زمین سے فٹ بھر اچھل پڑا - اور ہانپتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا - اس کا منہ اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں -
میں اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل گیا - دس سکنڈ کے اندر امام دین ڈائننگ روم میں تھا بچے کی سسکیوں اور چیخوں کی آواز سنکر واپس ڈائننگ روم میں لوٹا - اور دیکھا کہ امام دین چھوٹے گنہگار کو اپنا کرتا بطور رومال استعمال کرنے کے جرم میں زدوکوب کر رہا ہے -

"یہ لڑکا" امام دین نے منصفانہ انداز سے کہا "بدمعاش ہے — بڑا بدمعاش - اپنے ڈھنگوں کی بدولت اس کو قید خانے کی سیر کرنا پڑیگی"
امام دین نے پھر مجھ سے معافی مانگنا شروع کی -
"لڑکے سے کہدو" میں نے کہا کہ "صاحب خفا نہیں ہیں اور اسکو لیجاؤ"
امام دین نے ننھے مجرم کو میرے عفو کی اطلاع دی - جس کی چیخیں اب سسکیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں -
"اس کا نام" امام دین نے اس لہجہ میں کہا کہ گویا اس کا نام بھی اس کے جرم کا ایک حصہ ہے "ٹکرم دین ہے - اور یہ ایک بدمعاش ہے"
موجودہ خطرے سے نجات پا کر ٹکرم دین اپنے باپ کی گود میں پلٹ پڑا اور رنج کے لہجے میں کہا —

آنسو بہاتے آیا۔ شاید کسی نے بے رحمی سے اس سے کہدیا ہو کہ صاحب باغ کو خراب کرنے کی وجہ سے اس سے خفا تھے۔ اور انھوں نے نا ملائم الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اس کے جمع کردہ کوڑے کرکٹ کو بکھیر دیا کرم دین ایک گھنٹہ تک مٹی کے حصار اور دوسری چیزوں کو نیست و نابود کرنے میں مصروف رہا۔ اور جب کچہری سے واپسی پر اس نے مجھے سلام کیا تو اس کے اشکبار چہرے سے عفو خواہی مترشح ہو رہی تھی۔

میں نے فوراً امام دین سے کہا کہ وہ کرم دین سے کہدے کہ صاحب اس کو اختیار دیتے ہیں کہ جس طرح چاہے کھیلے اور دل بہلائے۔

اس پر چھوٹا بچہ خوش ہو گیا۔ اور زمین پر ایک حویلی کا نقشہ بنانے میں مصروف ہو گیا۔ جس نے پولو بال اور گیندے کے پھولوں والی دستکاری کی تلافی کر دی

چند مہینوں تک یہ چھوٹا موٹا عجیب و غریب بچہ ارنڈ کی جھاڑیوں میں پھرتا رہا۔ اس تمام عرصہ میں وہ گیندے کے پھینکے ہوئے باسی پھولوں ٹوٹے ہوئے شیشوں اور پروں — جو میرے خیال میں میرے پرندوں سے نوچے ہوئے تھے — سے شاندار حویلیاں بناتا رہا۔ ہمیشہ تن تنہا اور آپ ہی آپ گنگناتا ہوا۔

ایک دن ایک شاندار سنہری گھونگا اس کی چھوٹی سی عمارت کے قریب گر پڑا اور مجھے امید تھی کہ کرم دین اس کی مدد سے معمول سے زیادہ شاندار مکان بنائے گا۔ مجھے مایوس نہ ہونا پڑا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ تک کام کرتا رہا۔ اور اس کا گنگنانا۔ ایک دل خوش کن گیت میں تبدیل ہو گیا وہ زمین پر محل بنانے میں مصروف ہو گیا۔ جو درحقیقت ایک بہترین محل ہوتا کیونکہ وہ دو گز لمبا اور ایک گز چوڑا تھا۔ یہ محل کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا

دوسرے دن میری واپسی پر خیر مقدم کے لئے نہ تو کرم دین تھا اور نہ

سلام صاحب"۔ میں اس کے سلام کا درجہ عادی ہو گیا تھا کہ آج اس کی غیر موجودگی سے مجھے تکلیف پہنچی۔

دوسرے دن امام دین نے مجھ سے کہا کہ بچہ بخار میں مبتلا ہے اور کونین کی ضرورت ہے۔ اس کو بہت جلد ایک انگریز ڈاکٹر اور دوا مل گئی۔

"ان کے اعصاب کی حالت بہت خراب ہوتی ہے"۔ ان بچوں کے ڈاکٹر نے امام دین کے احاطے کو چھوڑتے ہوئے مجھ سے کہا۔

ایک ہفتہ بعد میں نے مسلمانوں کو ایک قبر کھودتے دیکھا ——

حالانکہ میں اس سے بچنے کے لئے بہت کچھ خرچ کرنے کو تیار تھا ——

امام الدین اپنے ایک دوست کے ساتھ کرم دین کے مردہ جسم کو جو ایک سفید کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ اپنے۔ ہاتھوں میں لئے ہوئے تھا ——

زرکار اچکن

(ایچ - جی - ولز ۱۸۶۶ء)

ولسن - بروملی - واقع کنٹ میں سنہ ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوا۔ موجودہ زمانے کے فسانہ نگاروں میں اس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک نئے اسلوب کا موجد ہے۔ اس کے افسانے موجودہ تحریکات۔ طبیعیات سیاسیات یا اشتراکی پلاٹوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

زرکار اچکن۔ ولز کے مختصر فسانوں کے ایک مجموعہ سے لیا گیا ہے جو سب سے اول سنہ ۱۹۲۷ء میں شایع ہوا۔ ترجمہ محمد محی الدین صاحب کا ہے

کہتے ہیں کہ کسی شہر میں جس کا محل وقوع خارج از بحث ہے ایک غریب لڑکا رہتا ہے۔ اس کی ماں نے اس کے لئے ایک خوبصورت اچکن سی دی تھی۔ سبز زمین پر سنہری بوٹے، بڑے بڑے، جیسے سبز و زرد

پر کھلے ہوئے لالہ کے پھول، بے حد نظر فریب۔ شوخ نارنجی گوٹ اشفق
کی طرح۔ چاندی کے بٹن گویا دمکتے تارے۔ وہ اسے پہن کر پھولوں نہ سمایا
گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑا تکتا رہا۔ بس ٹیپا ایب آتار دو۔ ماں للکھ کہتی
رہی مگر حیرت اور مسرت نے اس کے قدم زمین پر گاڑ دئے تھے۔ اس کا
جی وہاں سے ہٹنے کو نہ چاہتا تھا۔

وہ اسے ہر وقت اور ہر جگہ پہننا چاہتا تھا۔ ہر ایک کو دکھانے
پھرنا۔ ان تمام مقامات کی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ جنھیں
یا تو خود اس نے دیکھا تھا یا تاریخ میں پڑھا اور لوگوں کی زبانی سنا تھا
وہ خیال کرنے لگا کہ اگر یہ اچکن پہن کر وہ وہاں چلا جائے تو کیسی تفریح
ہوگی۔ کیسی ہل چل پڑ جائے گی۔ خاموش اور پراسن گلیوں میں ہر انگلی
اس کی طرف اٹھے گی اور ہر آنکھ اسی کی جانب نگراں کار ہوگی۔ وہ اسے
پہن کر سبزہ زار کی نرم اور لمبی گھاس اور ساحل کی نرم اور عمیق ریت
میں کھیلنا چاہتا تھا۔ کودنا، پھاندنا، لوٹ جانا۔ ہا! کیسا لطف ہوگا
مگر ماں نے اس کی اجازت نہ دی۔ اس نے کہا کہ یہ صرف بڑے بڑے
موقعوں پر پہننے کے لئے ہے۔ اور اسے نہایت حفاظت اور احتیاط
کے ساتھ رکھنا چاہیے کیونکہ ہماری غریبانہ حالت دوسری ایسی اچکن
بنانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس نے بٹنوں پر گلے پر اور ایسے مقامات
پر جن کے خراب ہو جانے اور پھٹ جانے کا اندیشہ تھا کم قیمت سرخ
کپڑا چڑھا دیا۔ لڑکے کو یہ بہت برا معلوم ہوا مگر ماں کے حکم کے سامنے
سر ہلانے کی مجال نہ تھی۔ آخر کار ماں نے اسے تہ کیا اور ایک رومال
میں لپیٹ کر الماری میں مقفل کر دیا۔ لڑکے کو ایسا محسوس ہوا جیسے
اب یہ اچکن ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گئی ہے وہ رات دن اسی کے
خیال میں ڈوبا رہتا اور اس لمحے کے تصور میں کھویا رہتا جب وہ کسی

شاندار موقع پر اسے پہنے گا۔ حفاظتی کپڑا ہٹا کر خراب ہونے سے بے پرواہ ہوکر۔ بغیر کسی احتیاط کے اس خیال سے اسے بے پایاں مسرت حاصل ہوتی۔ آہ اسے پہن کر وہ کیسا خوبصورت نظر آئیگا۔

اب اسے خواب بھی اچکن ہی کے پڑتے تھے ایک رات جب کہ وہ حسب معمول خواب میں اچکن پہنے کھڑا تھا۔ اس نے ایک بٹن پر سے سرخ کپڑا کھول دیا۔ ہائیں! وہ تعجب سے چونک پڑا۔ بٹن کی چمک دھندلی پڑ گئی تھی۔ اس کے دل کی ننھی سی کلی مرجھا گئی اور اس نے راکھ سے بٹن کو چمکانا شروع کیا وہ اسے پوری قوت سے گھستا اور رگڑتا رہا۔ مگر بٹن نہ چمکنا تھا نہ چمکا۔ وہ جاگ پڑا اور صبح تک اسی طرح جاگتا رہا۔ مدھم اور بے رنگ بٹن کی تصویر اس کے دماغ پر مرتسم ہو گئی۔ اس نے دلی رنج کے ساتھ اس وقت کا خیال کیا جب وہ کسی بڑے موقع پر اس اچکن کو پہنے گا۔ جس کا ایک بٹن زنگ آلود ہو چکا ہے۔ آہ کتنی معیوب بات تھی کئی دن تک یہی خیال اسے ستاتا رہا اور جب ایک دن اسے اچکن پہننے کی اجازت ملی تو وہ رہ نہ سکا اور سب کی نظر بچا کر اس نے اوپر کے بٹن کا کپڑا کونے سے ذرا علیحدہ کیا، تاکہ اپنے خواب کی تصدیق کرلے۔

وہ مسجد کو راستہ بھر خوش خوش گیا اور اس کا دل اسی قدیم اور خوشکن آرزو سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں آپ کو یہ معلوم کرا دینا ضروری ہے کہ اس کی ماں جمعہ کے روز اسے اچکن پہننے کی اجازت دے دیا کرتی تھی۔ جمعہ کے روز جب کہ وہ اپنے ماموں کی انگلی پکڑے نماز ادا کرنے محلہ کی مسجد میں جاتا تھا۔ مگر ہدایتوں اور تاکیدوں کے بعد وہ بھی جب مطلع بادلوں سے صاف ہو بارش کا خوف نہ ہو۔ گرد غبار نہ اڑ رہا ہو، اور کسی طرح اچکن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو بٹن اسی طرح ملفوف رہتے اور گلا بھی ڈھکا ہوا۔ ایک چھتری بھی اسے دی جاتی۔ تاکہ وہ اچکن کو دھوپ سے بچا سکے۔

کیونکہ دھوپ رنگ کی دشمن ہے اور جب وہ گھر واپس آتا تو ہمیشہ بڑی
احتیاط سے اس کی گرد جھاڑتا اسے برش کرتا اور شکنیں صاف کر کے ماں
کی ہدایت کے مطابق تہ کرتا اور رومال میں لپیٹ کر الماری میں مقفل کر دیتا۔
ان تمام قیود کی جو اس کی ماں نے اچکن کے استعمال کے متعلق عاید
کر رکھی تھیں وہ تعمیل کرتا رہا کیونکہ چوں و چرا کی گنجائش ہی نہ تھی۔ حتیٰ کہ
ایک شب وہ نیند سے بیدار ہوا اور لیٹے ہی لیٹے دریچہ میں سے اپنے منہ
پر چمکنے والے چاند کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ چاندنی
کوئی معمولی چاندنی نہیں اور نہ یہ رات ہمیشہ کی سی سادہ رات ہے
اسی داخلی ترغیب کے زیر اثر نیم وا آنکھوں سے وہ لیٹا ہوا چاند کو تک رہا
تھا۔ دل میں خیالات کا ایک سمندر تھا جو ان کبھی ختم نہ ہونے والی سرگوشیوں
کی طرح متلاطم تھا جو نازک لبوں سے نکل کر سخت دلوں کو مسحور کر لیتی ہیں
یکایک وہ اچھل کر اپنے بچھونے سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل زور
زور سے دھڑک رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک وہ کانپ رہا تھا اس لئے
مصمم ارادہ کر لیا وہ جانتا تھا کہ آج وہ ضرور اچکن پہنے گا۔ ضرور۔
وہ سہما ہوا تھا۔ خطرناک طور پر خوفزدہ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ خوش بھی
تھا اس کے دل میں بچپن کی معصوم مسرتوں کا چشمہ ابل رہا تھا۔
وہ اٹھا اور لمحہ بھر کے لئے دریچہ کے پاس کھڑا ہو کر باغ کو دیکھنے لگا
جس میں چاندی کا دریا لہریں لے رہا تھا وہ اس خیال سے بار بار کانپ
رہا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے فضا میں چھنکتی ہوئی چاندنی زیر زمین مخلوق
کی ہلکی ہلکی آوازوں سے مرتعش تھی۔ چھوٹے چھوٹے کیڑوں کا سریلا
راگ مسلسل سنائی دے رہا تھا۔ چرچراتے ہوئے تختوں پر سے وہ دبے
پاؤں گزر رہا اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی جاگ نہ اٹھے۔ پھر اس الماری
کے نزدیک گیا جس میں اس کی خوبصورت اچکن رکھی تھی۔ حسن اتفاق

سے وہ غیر مقفل تھی۔ اس نے آہستہ سے بیٹ کھولے دانتوں سے پوٹلی کی مضبوط گرہ کھولی اور ایک ایک کر کے بٹنوں اور گلے پر سے غلاف اتار نے لگا۔ آہا کیسی دلفریب کیسی خوشنما اچکن تھی، ہر بٹن اور ہر تہہ کا پھول دمکتا ہوا نظر آرہا تھا وہ اب بھی ویسی ہی نئی تھی جیسی کہ اس دن جب اس نے اسے پہلے روز دیکھا تھا ---- اسے وہ دن ہزارہا سال قبل کا معلوم ہو رہا تھا کسی بٹن کی چمک اندھی نہیں ہوئی تھی اور نہ زرکار پھولوں کا کوئی حصہ اکھڑا تھا اس کی۔ اس کی اپنی پیاری اچکن! اسے اتنی خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے جلد جلد آنسو گرنے لگے۔ پھر وہ بلا آواز پنجوں کے بل آہستہ آہستہ باہر جانے لگا۔ وہ کھڑکی کے پاس باغ کو دیکھنے کے لئے ایک منٹ تک ٹھہرا رہا۔ چاند کے نور میں غرق چمکتے ہوئے چمن تاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ پھر وہ ایک گرد بلیز پر چڑھ کر بیٹھا اور نئے لباس کی سرسراہٹ کو حتی الامکان کم کرتے ہوئے وہ باغ کی ایک روش پر باہر کودا۔ اب وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا جو اسی طرح سفید صاف نظر آرہا تھا جیسے دن کی روشنی میں نظر آیا کرتا تھا ہر کھڑکی سوائے ایک کے جس سے وہ ابھی ابھی باہر کودا تھا چشم خوابیدہ کی طرح بند تھی۔ درختوں کے خاموش سائے مختلف خوشنما جھالروں کی طرح دیواروں پر منعکس تھے۔

چاندنی رات کا باغ دن کے باغ سے بالکل مختلف تھا۔ جھاڑیوں سے اور پھیلے ہوئے درختوں کے پتوں سے چاندنی چھن چھن کر گر رہی تھی۔ ہر پھول اور ہر رخ سفید صاف نظر آرہا تھا۔ درختوں کے پوشیدہ جھرمٹ میں گانے والی چڑیوں اور حوض کے کنارے پانی میں رہنے والے جانوروں کی آواز ایک ہلکے شیریں نغمے کی طرح ہوا میں گونج رہی تھی۔ دنیا میں کسی جگہ بھی زندگی کا نام و نشان نہ تھا صرف وہ [illegible]

سیماب کا دریا موجیں مارنے لگا۔ ٹخنے تک، گھٹنے برابر، کمر تک سینہ اور گلے تک وہ نوں نازک ہاتھوں سے اس پانی کو چیرتے ہوئے۔ جس کے اندر ستارے، چاند، پورا آسمان منعکس تھا۔ وہ تیرنے لگا۔ کنارے پر پہنچا۔ وہ خوش تھا اسے حقیقی مسرت حاصل تھی۔ اس لئے کہہ میں خوش ہوں، بے حد خوش ہوں کہ ایسے لباس میں ملبوس ہوں جو ہر طرح مناسب حال ہے۔"

وہ خوش خوش ہانپتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ سڑک سیدھی تھی۔ تیر کی طرح سیدھی۔ چاند کے نیچے آسمان کی نیلی گہرائیوں میں غائب ہونیوالی چمکتی ہوئی سفید سڑک جیسے دودھ کی نہر اس پر وہ دوڑ رہا تھا دونوں طرف درختوں پر پرندے چہچہاتے تھے۔ ناچتے کودتے ہوا میں ہاتھ اچھالتے ان کپڑوں میں ملبوس جو اس کی ماں کے محبت بھرے، ان تھکے ہاتھوں نے بنائے تھے وہ چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں گرد و غبار اڑ رہا تھا۔ لیکن اس کے حق میں وہ غبار نور تھا، ہلکا ہلکا دھیما دھیما۔ اسے ایک خوبصورت تیتری اڑتی نظر آئی۔ رنگین قوس قزح کے شوخ رنگوں میں رنگی ہوئی۔ وہ اس کے سر کے گرد چکر لگانے لگی پہلے تو اس نے کچھ خیال نہ کیا پھر وہ بھی ناچ ناچ کر اس کے ساتھ چکر لگانے لگا "نازک تتلی!" اس نے کہا "اے اس حسین رات کی تتلی جو دنیا کی کل راتوں سے بڑھ کر حسین ہے کیا میری یہ اچکن تجھے خوبصورت معلوم ہوتی ہے؟ پیاری تتلی کیا تو میری اچکن کو ایسا ہی خوبصورت سمجھتی ہے جیسے تیرے یہ رنگین پر ہیں اور جیسا یہ زمین و آسمان کا سیمابی نور ہے" تیتری اور زیادہ قریب ہو کر چکر کاٹنے لگی۔ اتنی قریب کہ اس کے قرمزی پر ایک مرتبہ لڑکے کے ہونٹوں سے چھو گئے۔

دوسرے روز بہ گوروں کو جنگل میں اس کمسن لڑکے کی لاش ملی جو

سائے ادھر ادھر ناچ رہے تھے۔ درختوں کے پتوں کے کناروں پر روپہلی گوٹ ٹنکی ہوئی تھی۔ اور پھولوں پر شبنم کے موتی جمے ہوئے تھے رات یقیناً گرم تھی اور تاروں بھرا آسمان وسیع اور قریب تر۔

اتنی بے پایاں مسرت کے باوجود لڑکا تھوڑی دیر تک خائف اور ششدر رکھڑا رہا پھر ایک عجیب دھیمی چیخ کے ساتھ ہوا میں ہاتھ پھیلا کر دوڑا گویا بیک وقت تمام دنیا کو اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے باغ کے کٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت راستوں پر سے گذرنے کا اسے شوق نہ تھا اس لئے سبزے کی روشوں اور پھولوں کے تختوں کو روندتے گملوں کو پھاندتے، پودوں سے الجھتے، دلدل میں پھنستے ہوئے وہ بے تحاشا دوڑنے لگا وہ اس اونچی جھاڑی کے پاس پہنچا جو چوپایوں سے باغ کی حفاظت کے لئے بطور باڑ کے لگائی گئی تھی۔ مگر وہاں بھی نہ رکا اور اس کے اندر گھس پڑا۔ کانٹوں سے اس کے جسم کو کئی جگہ خراش پہنچی اور نئی اچکن کئی جگہ سے پھٹ گئی۔ وہ پتلی پتلی شاخوں کے اندر جکڑ گیا۔ پھر زور کر کے نکلا۔ کئی کانٹے اس کے بدن میں چبھے ہوئے رہ گئے مگر اسے اس کی پروا نہ تھی۔ قطعاً۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ بھی پھنسنے کا ایک طریقہ ہے وہ طریقہ جس کی اسے مدت سے آرزو تھی۔ اس نے کہا میں خوش ہوں کہ میں نے موقع کے مناسب لباس بھی پہنا۔ میں خوش ہوں — بڑا خوش!!

جھاڑی کے باہر ایک جوہڑ تھا، جو بطوں کے تیرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ غلیظ و کثیف پانی اور دلدل سے لبریز مگر وہ صرف دن کے وقت ایسا نظر آتا تھا۔ رات میں چاندنی رات میں خصوصاً آج کی نورانی رات وہ ایک حوض تھا جس میں سیماب لہرا رہا تھا۔ مینڈکوں کی خوش آیند موسیقی سے فضا میں ایک تموج پیدا تھا لڑکے نے قدم رکھا!

زرکار اچکن میں ملبوس ایک گہرے گھڑے میں پڑی تھی۔ اس کی گردن اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ لباس نہ صرف خون سے آلودہ تھا بلکہ پانی میں تر اور کیچڑ اور کائی میں لتھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کے چہرے سے اذیت کے آثار بالکل ناپید تھے۔ اور بجائے اس کے ایک تبسم اس کے لبوں پر کھیل رہا تھا۔ ابدی تبسم۔!

قیدی

جان گالز وردی ۱۸۶۷ء

جان گالز وردی، انگریزی کا مشہور ڈراما نویس اور ناول نگار ہے۔ اس نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۹۰ء میں وکالت کی سند حاصل کی، مگر ادبیات کو نصب العین بنایا۔ اس نے بے شمار ناول، ڈرامے، مختصر قصے اور مضامین لکھے۔ اس کے مختصر قصوں کے مجموعے "ڈارک فلاور" اور "کاروان" بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ "قیدی" موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے گالز وردی کا بہترین قصہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس کا ترجمہ منصور احمد صاحب نے کیا ہے جن کی اجازت سے اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے۔

لندن کے ایک باغ میں گرمیوں کی ایک سہانی صبح کا ذکر ہے۔ پرندے ابھی اپنے بہاری نغمے گا رہے تھے اور درخت ابھی پھولوں سے لدے ہوئے تھے کہ دفعتاً ایک ہمارے دوست نے کہا "کہیں مینا بول رہی ہے" کستورے یہاں تھے۔ اور توتی، چڑیاں بھی نظر آ جاتی تھیں۔ رات کو الو بھی بولتا تھا۔ اور سال میں ایک دفعہ کوئل بھی کینٹ اور سرے کے علاقوں سے بھول بھٹک کر درختوں کے اس سر سبز جزیرے میں آ نکلتی تھی مگر مینا ہم نے یہاں کبھی نہ دیکھی تھی۔

ہمارے دوست نے کہا۔ "وہ دیکھو! پھر اس طرف سے آواز آئی ہے!" وہ اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا جو پاس ہی واقع تھا۔ جب وہ واپس ہوا

تو اپنی جگہ پر بیٹھ کر کہنے لگا "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لوگ بھی پنجروں میں جانور رکھنے کے شائق ہیں"۔ ہم نے کہا "یہ بلبل ہمارے باورچی نے پال رکھا ہے"۔

"ناہنجار" اس کے منہ سے یہ لفظ بے ساختہ نکل گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی نہایت زبردست احساس بیدار ہو گیا ہے۔ جس کو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔

یکایک وہ یوں برس پڑا:-

"میں کسی چیز کو محبوس دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ پرندے ہوں یا آدمی۔ مجھے اس خیال ہی سے نفرت ہے"۔ پھر ہماری طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر، گویا ہم نے اس سے یہ باتیں کہلوا کر کوئی فائدہ حاصل کر لیا ہے اس نے فوراً ہی اپنا سلسلہ کلام شروع کیا۔

چند سال کا ذکر ہے کہ میں جرمنی کے ایک شہر میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا جو ان دنوں تمدنی معاملات کے متعلق کچھ تحقیقات کر رہے تھے ایک دن وہ کسی قید خانے کے معائنہ کے لئے جا رہے تھے کہ انھوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی قید خانہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے میں ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اس دن بھی آج کی طرح مطلع بالکل صاف تھا۔ ہر چیز پر وہی سرد جگمگاہٹ رقص کر رہی تھی جو صرف جرمنی کے بعض علاقوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ قید خانہ جو شہر کے عین وسط میں واقع تھا ان قید خانوں میں سے تھا جو پینٹن ول کے نقشے کے مطابق ستارے کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ قید خانہ کا دستور اور نظام وہی تھا جو سالہا سال گزرے یہاں رائج تھا۔ جرمن اس وقت بھی اور اس میں شک نہیں کہ اب بھی قیدیوں کو کامل تنہائی کی جانکاہ تعذیب میں مبتلا کرنے کے بیہودہ خیال کو اپنے دل میں جگہ دئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس زمانہ میں یہ ان کے لئے ایک نیا کھلونا تھا اور وہ پورے مجنونانہ جوش کے ساتھ اس پر عمل پیرا تھے۔ [illegible]

ہے کہ جس کام کو وہ شروع کرتے ہیں اس میں ایسا ہی انہماک دکھاتے ہیں
میں قید خانے کے متعلق کچھ بیان نہیں کرنا چاہتا۔ نہ یہ کہ ہم نے اس میں کیا
کیا دیکھا۔ جن خوفناک طریقوں اور اصولوں پر ایک ایسا محکمہ چل سکتا ہے
ان سب پر یہاں عمل کیا جاتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہنے کی جرات بھی کروں گا کہ
انتظام اچھا تھا۔ اور قید خانے کے حاکم نے بھی ہر موقع پر اپنی ذات کے
متعلق مجھ پر اچھا اثر ڈالا میں تمہیں صرف ایک بات بتاتا ہوں۔ جس کو میں
کبھی نہ بھولوں گا۔ اور جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے جانداروں کو اسیر کرنے کا
احساس کروایا خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان بڑے ہوں یا چھوٹے۔
ہمارا دوست یہاں ٹھہر گیا۔ پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں کچھ
اور طیش ملا ہوا تھا۔ اور جیسے یہ طیش اسے اپنی خاموش فطرت کے خلاف
بغاوت کرنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ اس نے کہا:۔

جب ہم نے اس مقام کو جس کے در و دیوار خاکی رنگ کے تھے اچھی
طرح دیکھ لیا تو حاکم قید خانے نے میرے دوست سے دریافت کیا کیا آپ
ایک دو عمر قیدی بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو ایک ایسا شخص دکھاؤنگا
جسے یہاں رہتے ہوئے تتائیس سال ہو گئے ہیں۔ مجھے اس کے الفاظ
اب تک یاد ہیں اس نے کہا تو وہ تنہائی کی قید سے کچھ فرسودہ سا ہو گیا ہے
جب ہم اس قیدی کی کوٹھری کی طرف جا رہے تھے تو انھوں نے ہمیں
اس کی سرگذشت سنائی۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ ایک
فرنیچر بنانے والے نے مددگار کے طور پر اسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا
مگر اس نے نقب زنوں کی ایک ٹولی کے ساتھ ملکر اپنے آقا کو لوٹنے کا ارادہ
کیا ڈاکہ کے دوران میں اس نے بدحواسی کے عالم میں ایک ہی ایسا وار کیا
کہ بیکار خانہ دار اسی جگہ مر گیا۔ قاتل کے لئے موت کا حکم دیا گیا۔ مگر حکومت کی
سفارش سے جو ان دنوں جنگ سار ڈوا کے خونیں نظاروں کو دیکھ دیکھ

گھبرا گئی تھی، اس کی سزا عمر قید میں تبدیل ہو گئی ہے۔"

جب ہم اس کی کوٹھری میں داخل ہوئے وہ بے حس و حرکت کھڑا اپنے کام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو اس کی عمر چالیس سال سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہ ہو گی لیکن وہ ساٹھ سال سے کم کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کا جھکا ہوا قد اور کانپتا ہوا تباہ شدہ جسم ایک امیلے رنگ کی چادر سے جو پوشاک کے بجائے کے لئے پہنی جاتی ہے ڈھنپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور اس میں وہی انداز آ گیا تھا جو عموماً قیدیوں کی شکلوں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے نقوش بالکل بدنما ہو گئے تھے اس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی نظر آنے لگی تھیں۔ ان کا رنگ مجھے بھول گیا ہے۔ مجھے اس میں شک ہے کہ ان میں کوئی رنگ تھا بھی۔ جب ہم ایک ایک کر کے آہنیں دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اس نے تعظیم کے لئے اپنی ٹوپی سر سے اتاری جو ان تمام چیزوں کی طرح جو اس نے پہن رکھی تھی مٹیالے رنگ کی تھی۔ اس کے سر میں بھی جس پر اب بہت تھوڑے بال نظر آ رہے تھے خاک پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی وہ ہمارے سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا اور مسکین نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا اسی طرح جیسے ایک قیدی دن کی روشنی کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ کبھی تم نے کسی چھوٹے بچے کو دیکھا ہے جو پہلی مرتبہ بیمار ہوا ہو وہ اپنی حالت کو دیکھ دیکھ کر کتنا حیران اور پریشان ہوتا ہے۔ بس یہی حالت اس کی تھی لیکن اس کی صورت میں ایک غیر معمولی نکبت تھی۔ ہم نے بہت سے قیدیوں کو دیکھا تھا مگر ان سب میں یہی ایک تھا جس کی طبیعت میں ایک خوفناک حلم تھا۔ جب وہ اپنی کانپتی ہوئی آواز میں "ہاں صاحب ... نہیں صاحب" کہتا تھا۔

ہے کہ اس میں قوت ارادی کی ایک رمق بھی باقی نہ رہی تھی"

ہمارا دوست یہاں رکا، اور اپنے دل میں اس نظارے کا تصور لانے
پر بھی اس کی پیشانی پر ایک بل پڑ گیا۔ اس نے کہا:۔

اس کے ہاتھ میں سخت کاغذ کا ایک ورق تھا۔ جس پر وہ بہرے اور گونگے اشخاص کے لئے ایک خاص طرز تحریر میں نئے عہد نامہ کی کچھ عبارت نقل کر رہا تھا۔ جب وہ ہمیں یہ بتانے کے لئے کہ گونگے اور بہرے اسے کس آسانی سے پڑھ سکتے ہیں اپنی انگلیاں کاغذ کے حروف پر پھیر رہا تھا تو ہم نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ ایک چکی چلانے والے کی طرح گرد آلود ہو رہے تھے۔ کوٹھڑی میں گرد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ گرد نہ تھی جو اس کے ہاتھوں پر لگی ہوئی تھی۔ بلکہ انسانی پودے کا وہ فضلہ تھا جو بیج بنتے وقت نکل آتا ہے۔ جب وہ کاغذ اوپر کو اٹھاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی بھنگے کا پر کانپ رہا ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ یہ قاعدہ جس کے مطابق تم لکھ رہے ہو کس کا ایجاد کیا ہوا ہے اور ہم نے کسی کا نام بھی لیا اس نے کہا۔ نہیں نہیں وہ صحیح نام یاد کرنے کی کوشش کی شدت سے کھڑا کانپ رہا تھا۔ آخر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور دھیمی آواز سے کہنے لگا "آہ! میں نہیں بتا سکتا" پھر یکایک وہ نام اس کی زبان پر آ گیا۔ اس وقت وہ پہلی مرتبہ اپنی ہیئت میں انسان نظر آیا۔ آزادی کی قدر و قیمت۔ دوسروں سے ہمارے تعلقات کے حقیقی معانی آوازوں اور نظاروں کے ذریعہ سے لمحہ بہ لمحہ ہمارے دلوں کے ایجاد کی غرض سے کسی بات کو یاد رکھنا اور پھر اس کے استعمال کی ضرورت الغرض سب کو اس نے پہلے میں کبھی نہ سمجھا تھا۔ اس شخص کے لئے تم جانتے ہو اپنی زندگی میں یادداشت کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ اس

گزر تک نہ ہو سکے وہ کیفیت جو محض ایک نام کے یاد آجانے سے اس کے چہرہ پر نمایاں ہو گئی بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی سوکھے ہوئے درخت پر صرف ایک سبز پتہ باقی رہ گیا ہو۔ سنو! انسان ایک حیرت انگیز چیز ہے کوئی مخلوق نہیں جو انسان کی طرح مصائب برداشت کر سکے!"

ہمارا دوست اپنی جگہ سے اٹھا اور ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

"اس کی دنیا بڑی وسیع نہ تھی۔ ایک ہی کمرہ تھا جو زیادہ سے زیادہ پانچ گز لمبا اور چار گز چوڑا تھا۔ وہ اس میں ستائیس سال گزار چکا تھا بالکل بے مونس و بے یار۔ ان قید خانوں کا انتظام اتنا زبردست ہوتا ہے کہ کوئی پرندہ تک پاس نہیں پھٹک سکتا۔ ذرا سوچو کہ زندگی کی اس جانکاہ منزل میں سے گزرنے کے لئے اور جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے آدمی کی کتنی قوت صرف ہوتی ہو گی!"

وہ ہماری طرف مڑ کر کہنے لگا۔

تم کیا خیال کرتے ہو کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس کے ہوش و حواس کو اس حد تک بھی برقرار رکھا تھا؟ میں تمہیں بتاتا ہوں ابھی ہم اس کی اس تحریر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اس نے ہمارے ہاتھ میں لکڑی کا ایک تختہ دے دیا جو ایک بڑی تصویر کے برابر تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی جو ایک باغ کے عین وسط میں بیٹھی ہوئی تھی اور جس کے ہاتھ میں رنگ برنگ کے پھول تھے۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی ندی بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ کچھ گھاس تھی اور ندی کے کنارے پر ایک عجیب و غریب قسم کا پرندہ بیٹھا ہوا تھا جو پہاڑی کوے سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ لڑکی کے ایک طرف ایک درخت تھا جو بھاری بھاری پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ ان پھلوں میں ایک ایسا تناسب تھا جو کبھی کسی درخت میں نظر نہیں آیا پھر اس میں ایک ایسی

بات بھی تھی جو تمام درختوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے ان پھولوں میں جان ہے اور وہ انسان کے دوست ہیں
لڑکی اپنی گول گول آنکھوں سے سیدھا ہماری طرف دیکھ رہی تھی اور
یوں معلوم ہوتا تھا کہ پھول جو اس کے ہاتھ میں ہیں وہ بھی ہماری طرف
دیکھ رہے ہیں۔ تمام تصویر! میں کیا کہوں ۔.... ایک معجزہ نظر
آتی تھی۔ تمام رنگوں کی نمائش ہے۔ یہ بالکل قدیم اطالوی مصوری
کا نمونہ معلوم ہوتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی تکمیل
کے لئے مشکلات پر قلبہ حاصل کرنے میں انتہائی جانفشانی سے کام
لیا گیا ہے۔ ہم میں سے ایک نے اس سے سوال کیا کہ کیا اس نے
تصویر بنانا کسی سے سیکھا تھا۔ لیکن اس غریب کو ہمارا سوال
سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ اور وہ کہنے لگا نہیں نہیں منتظم صاحب جانتے ہیں کہ
میرے پاس کوئی نمونہ نہ تھا۔ یہ میرا اپنا ہی تخیل ہے۔ وہ ہماری طرف
دیکھ کر مسکرایا۔ مگر اس کی مسکراہٹ شیطان کو بھی رُلا دینے والی تھی
اس نے اس تصویر میں وہ تمام چیزیں رکھ دی تھیں جن کے لئے
اس کی روح بےقرار تھی۔ عورت، پھول، پرندے۔ درخت، نیلا
آسمان۔ بہتا ہوا پانی اور اپنے وہ تمام احساسات و جذبات جو اس کے
دل میں ان تمام چیزوں کی دوری سے پیدا ہوئے تھے ہمیں بتایا
گیا کہ اس نے اس تصویر کو اٹھارہ سال میں بنایا ہے۔ اس عرصے
میں وہ اسے بار بار مٹاتا اور بار بار بناتا رہا۔ اور موجودہ تصویر اس
کا سوداں نقش تھا یہ ایک شاہکار تھا۔ ہاں۔ وہ ستائیس سال سے
وہاں رہتا تھا۔ اس کو زندہ رکھنے کے لئے اس جیتی جاگتی موت
کے منہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ جہاں اس کے حواس معطل پڑے ہوئے
تھے۔ دیکھنے سننے سوچنے سمجھنے اور کسی چیز کو محسوس کرنے کا خیال تک

اس کے حافظے سے محو ہو چکا تھا۔ اس کی بھوکی روح کی غذا صرف اس لڑکی کی تصویر رہ گئی تھی جس کی آنکھیں متحیر تھیں۔ اور جس کے ہاتھ میں پھول تھے۔ بیشک یہ تصویر انسانی ولولے اور شوق کی ہو بہو نقل بھی اور کمال فن کا عظیم ترین اظہار تھا جو تمام عمر میں میرے دیکھنے میں آیا۔"

ہمارے دوست کے چہرہ پر مختصر سی مسکراہٹ آ گئی۔

"انسان کا دل اتنے پردوں میں محفوظ ہے کہ اس شخص کی مصیبت کا پورا پورا احساس مجھے تب بھی نہ ہوا گو بعد میں میں نے اسے محسوس کر لیا جب حاکم قید خانہ نے اس سے اس کی صحت کی نسبت کچھ پوچھا اور وہ جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ آہ! میں اپنی موت کے دن تک بھی ان آنکھوں کو نہ بھول سکوں گا۔ وہ حزن مجسم تھیں۔ ... سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو اس نے گزار دی تھیں اور سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو ابھی حد تک پہنچنے کے لئے اسے گزارنی تھیں ان آنکھوں میں بسے جہاں تک رہی تھیں۔ اگر ان تمام آزاد انسانوں کی آنکھوں کی رحم انگیز التماکیاں جن کو میں نے عمر بھر میں دیکھا ہے یکجا جمع کر لی جائیں تو پھر بھی وہ ان آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ میں ان کی تاب لا نہ سکا۔ اور جلد ہی اس کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ اس وقت دکھ اور تکلیف کے اس تقدس کا احساس مجھ میں پیدا ہوا اور اب تک میں اسے محسوس کرتا ہوں جو کہتے ہیں روسیوں میں باوجود ان کے وحشیانہ پن کے موجود ہے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم سب کو اس کے سامنے جھک جانا چاہیئے تھا میں بے گناہ اور آزاد تھا۔ مگر اس کے سامنے اپنا وجود مجھے مقید اور گنہگار معلوم ہوتا تھا۔ جو جرم بھی اس سے سرزد ہوا تھا۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں اس برباد شدہ انسان کے خلاف ایسا گناہ کیا گیا تھا کہ مجھے

اپنی ذات اس کے پاؤں کی خاک ہوتی نظر آرہی تھی۔ جب میں اس کی نسبت خیال کرتا ہوں، تو اپنی نوع کے خلاف میرا جوش دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور اس وقت ساری دنیا کے مجبوس جانداروں کا درد میرے ایک سینہ میں آکر اٹھتا ہے"۔

ہمارے دوست نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور پورے ایک منٹ تک وہ خاموش رہا۔ آخر اس نے کہا۔

"واپسی پر ہم سٹینڈ پارک میں سے گزرے۔ وہاں آزادی کی پوری شان نظر آتی تھی۔ روشنی کافی تھی۔ سیب۔ لیموں۔ انجیر۔ شاہ بلوط۔ صنوبر اور سفیدہ غرض ہر قسم کے درختوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ ہر ٹہنی اور ہر پتہ خوشی سے لچک رہا تھا۔ پرندے جو آزادی نشان ہیں ادہر ادہر اڑتے پھر رہے تھے۔ اور انھوں نے اپنی نغمہ ریزیوں سے سارے چمن کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ تمام خطہ ایک مسحور سرزمین معلوم ہوتا تھا۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے مجھے اس وقت خیال آیا کہ صرف انسان اور مکڑی ہی دو ایسی مخلوقات ہیں جو دوسرے جانداروں کو اس طرح عذاب دے دے کر ہلاک کرتے ہیں۔ اور دونوں میں سے پھر صرف انسان ایسا ہے جس کا دل اپنی نوع کو تباہ کرنے پر بھی نہیں دکھتا۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ تاریخ فطرت کی ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے اور میں تم سے کہہ سکتا ہوں کہ اس شخص کی آنکھوں کو اور ان آنکھوں کے دکھ اور درد کو ہمیشہ کے لئے ایک مرتبہ دیکھ لینے سے، جس طرح میں نے انہیں دیکھا، اپنی نوع کے متعلق اس قسم کا خیال تک ہمارے دل سے محو ہو جاتا ہے۔ اس رات میں ایک قہوہ خانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا مختلف قسم کے ساز بج رہے تھے۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بازار میں سے ہر قسم کے آدمی — دوکاندار، سپاہی

تاجر۔ دفتروں میں کام کرنے والے۔ پادری۔ بھیک مانگنے والے۔ خوش رہنے والی عورتیں گزر رہے تھے۔ روشنی کھڑکیوں میں سے چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ اور درختوں کے پتے گہرے نیلے آسمان کے سامنے جھوم رہے تھے۔ لیکن میں نہ کچھ سنتا تھا نہ دیکھتا تھا۔ میرے سامنے صرف وہ بھوکا اور غریب چہرہ تھا۔ اس کی پر درد آنکھیں تھیں۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ تھے۔ اور وہ تصویر تھی جو اس نے اس جہنم میں تیار کی تھی۔ اور اس کے بعد جب کبھی میں نے کسی قیدی کو دیکھا ہے یا کسی قیدی کے متعلق کچھ سنا ہے میرے سامنے یہی نقشہ آ گیا ہے "

ہمارا دوست خاموش ہو گیا ذرا سی دیر کے بعد وہ اٹھا اور عذر خواہی کرتا ہوا چلا گیا۔

سیب کا درخت

کیتھرائن مینسفیلڈ۔ (۱۸۹۰ء تا ۱۹۲۳ء)

مس مینسفیلڈ شہر نیوزی لینڈ میں پیدا ہوئی۔ اپنی عمر کا ابتدائی حصہ وہیں بسر کیا۔ مینسفیلڈ اور اس کے شوہر جے مڈلٹن میرے کی ادبی شہرت کی ابتدا ایک تبصرہ "راتھم" نامی سے ہوئی۔ مس مینسفیلڈ کے مختصر قصوں کے مجموعے "بلس" اور "گارڈن پارٹی" کافی طور پر مشہور رہے ہیں۔ بعد ازاں اس کے شوہر نے ایک اخبار "ایتھی نیم" کے نام سے جاری کیا جس کی مستقل ریویو نگار مس مینسفیلڈ ہی تھی۔ "سیب کا درخت" اس کا بہترین مختصر قصہ ہے۔ اس کا ترجمہ محمد محی الدین صاحب نے کیا۔

قدیم مکان سے متعلق دو خانہ باغ تھے۔ ایک جو صحرائی باغ کہلاتا تھا ترکاری کے کھیت کے پرے واقع تھا۔ اس میں معمولی قسم کے خودرو درخت اگے ہوئے تھے۔ جن کے نامعلوم وجہ سے وہ زمین [illegible]

اس کی درستگی کی طرف کوئی توجہ نہ کی جاتی۔ اور نہ ہم وہاں کبھی کھیلنے جاتے ہاں البتہ۔ ہر دوشنبہ کی صبح۔ باغ کے درمیانی احاطہ میں خادمہ دھوئے ہوئے کپڑے سکھانے کے لئے ٹانگ دیتی۔ دادی کا پرانا سایہ ابا کا گھر میں پہننے کا قمیص۔ ملازموں کے سوتی موزے اور چھوکری کے کثیف کپڑے ہوا میں اڑتے رہتے۔

لیکن دوسرا باغ۔ گھر سے ذرا فاصلہ پر اور پوشیدہ ایک چھوٹی سی ٹیکری کے پیچھے واقع تھا۔ یہ رقبہ میں بھی وسیع تھا۔ نالے کے کنارے تک پھیلا ہوا۔ اور غالباً "صحرائی" باغ سے زیادہ زرخیز بھی تھا۔ کیوں کہ اس میں قسم قسم کے شیریں میووں سے لدے ہوئے درختوں کے تلے لانبی لانبی نرم گھانس اس کثرت سے اگی ہوئی تھی کہ دوڑنے میں ہمارے پیر گھٹنوں تک اندر دھنس جاتے تھے۔ فرصت کے گھنٹوں میں ہمارا دلچسپ ترین مشغلہ یہ ہوتا کہ ہم درختوں کے نیچے تیز ہوا سے گرے ہوئے پھلوں کو چنتے پھرتے جن کو پرندے ہم سے قبل آدھے سے زیادہ کھا چکے ہوتے۔ بڑے بڑے پھولے ہوئے سنگترے۔ کھٹی نارنگیاں جو نمک کے ساتھ بڑا مزا دیتیں مگر جنکو کھانے کے بعد دانت اس قدر کھٹے ہو جاتے کہ کھانا نہ کھایا جاتا۔

ایک سال باغ جنت کی طرح ہمارے اس باغ میں بھی ایک شجر ممنوعہ ہویدا ہوا۔ یہ ایک سیب کا درخت تھا۔ جس کی اہمیت میرے والد نے ایک دوست کی مدد سے اتوار کے روز۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تقریباً ٹہلتے ہوئے دریافت کی۔

"اللہ اکبر۔ دوست نے درخت کے قریب پہونچکر دیکا ایک چہرہ کی سرک رنگ دیئے سے استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ کیا یہ — نہیں ہے کہ اس مقام پر جہاں میں نے خط کھینچ دیا ہے۔ کوئی نہایت ہی عجیب غریب ثقیل الصوت نام تصور کر سکتے۔ جو اس نامہ سے ذہن سے نہ ہو گیا

میرا بھی یہی خیال ہے" میرے والد نے یونہی سرسری طور پر کہہ دیا۔
"اللہ اکبر۔ دوست نے پھر کہا" پھر تو یہ نہایت ہی بیش قیمت اور نادر سیب ہیں۔ بالکل عدیم المثال۔ اور تم یوں بے احتیاطی سے اس کی پرورش کرتے ہو۔ یوں ضایع کر دیتے ہو"
"ہاں۔ یوں سیب تو بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے میرے والد نے اب بھی لاپرواہی سے کہا۔ اور ذرا دلچسپی سے اچٹتی ہوئی سی نظر درخت پر ڈالی۔
"بازار میں یہ نہیں ملتے۔ کمیاب ہیں بلکہ نایاب کہو خصوصاً آجکل تو انگلستان بھر میں کہیں دستیاب نہیں ہو سکتے" دوست نے کہا اور والد کے دل میں خوشی کی چنگاری بھڑک اٹھی کیونکہ والد خود بڑے اصول کے آدمی تھے۔ اور اپنی آپ مدد کرو" ان کا دستور العمل سخت تھا ہر وہ قیمت جسے وہ گھریلو ضروریات کی چیزوں کے لئے ادا کرتے ان کے لئے اتنی تکلیف دہ ہوتی کہ انہیں اپنی خریدکردہ اشیاء کی ارزانی اور عمدگی کی تعریف کے برابر کوئی اور چیز بھلی نہ لگتی۔ بڑھاپا ان سے کوسوں دور تھا۔ اور شباب و ترقی کی امنگ ان کے دل میں لہریں لے رہی تھی۔ جزرسی اور کفایت شعاری ترقی کا بڑا گر ہے۔ اسی وجہ سے وہ گھنٹوں خرید لینے کے پہلے اور خرید لینے کے بعد سوچا کرتے کہ آیا ان کی خرید کردہ اشیاء کی معنی افادیت اس کی ادا کردہ قیمت کے برابر ہے یا نہیں۔
اب یہ انکشاف کہ ایک ایسے بیش قیمت سیب کا درخت انہیں مفت میں مل گیا ہے جس پر ان کا دوست رشک کرتا ہے انکے فخر کے لئے "سمند ناز پر ایک اور تازیانہ تھا"
"اس درخت کو ہاتھ نہ لگانا۔ سنتے ہو۔ بچو! انھوں نے سختی سے

ساتھ دوست کے روبرو ہی کہہ دیا اور اس کے جانے کے بعد۔

"اگر میں کسی کو اس درخت کا سیب کھاتا ہوا دیکھ پاؤں تو یاد رکھو کہ تم سزاءً قبل از وقت سونے کے لئے بھیجدیئے جاؤگے جس سے نہ محض تمہیں اماجان کی پرلطف کہانیاں سننے کا موقع نہ ملیگا۔ بلکہ تمہاری پیٹھ بھی عمدگی سے سہلائی جائے گی"۔

اس تاکید اور ہدایت مزید کا جو نتیجہ سعادت مند فرزندوں پر ہونا چاہیئے تھا وہ ہم پر ہوا

ہر اتوار کو گرجا سے آنے کے بعد ابا۔ جن کے پیچھے میں اور بوگی ہوتے پھولوں کے تختوں کے درمیان سے گزر کر اور لالہ کے تھالے کے پار ہو کر موٹے سنگترے کے درخت سے ورے۔ سفید گلاب اور گیند کی جھاڑیوں سے نکلکر باغ کے اس مخصوص خطہ کی طرف جاتے جہاں۔ شجر ممنوعہ کنواری مریم کی طرح۔ کسی پراسرار ذریعہ سے اپنی نورو افزائی کو محسوس کر کے اور اس پر نازاں۔ اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ کھڑا ہوا دکھائی دیتا اس کی شاخیں میووں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہوتیں اور اس کے چمکدار پتے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوتے۔ ابا کے ابھرے ہوئے سینہ سے اطمینان و مسرت کی ایک آواز نکل جاتی۔ وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیتے اور طمانیت بخش نظروں سے باغ کی طرف دیکھتے رہتے۔ آہ! جس وقت اس باغ کو خریدا گیا۔ کوڑیوں کے مول۔ نہ تو بائع اور نہ مشتری اس کی اصلی قیمت سے واقف تھے اگر گھر بار جل کر راکھ ہو جاتا تب بھی والد کو اتنی فکر نہ ہوتی جتنی اس درخت کے کٹ جانے یا اس کو خفیف سے خفیف نقصان پہنچ جانے سے ہوسکتی۔ ہم ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتے۔ بوگی اور میں۔ بوگی اپنے گھرو نیچے لگے ہوئے گھٹنوں کو ایک دوسرے سے

ٹوپی۔ جس پر موٹے حرفوں میں انمٹ سیاہی سے کسی جہاز کا نام لکھا ہوا صاف نظر آتا۔ کیونکہ دراصل وہ ایک ملاح ہی کی تھی۔ جس کے انتقال کے بعد اس کے سامان کے ہراج میں اسے ہم نے خریدا تھا۔

سیب سبز ہی مائل زرد سے بالکل زرد ہو گئے تھے۔ ان پہ گہرے سرخ رنگ کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ یہ سرخی پھیلتی ہوئی۔ زردی پہ غالب آ گئی تھی۔ اور روز افزوں شوخ رنگ بڑھتا رہتا اور آخر کار کل سیب ایک خوبصورت چمکدار جامنی رنگ میں رنگا ہوا نظر آنے لگا۔

آخرش وہ دن آیا جب کہ ابا نے اپنے واسکوٹ کی جیب سے سیب کے دستہ کا ایک چھوٹا سا چاقو نکالا۔ اور نہایت آہستگی اور جتیاط سے نیچے جھکی ہوئی ٹہنی سے لٹکتے ہوئے دو سیب جدا کئے۔ "واللہ" میرے ابا نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیسے گرم ہیں۔ یہ عجیب و غریب سیب ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے کمیاب بلکہ نایاب"۔ وہ انہیں ہاتھوں میں پھرا پھرا کر کہنے لگے۔

دیکھو انہوں نے کہا۔ "کوئی دھبہ۔ کوئی داغ۔ کوئی بدنما نشان تک نہیں"۔

اس باغ کا ایک چکر لگایا۔ میں اور لوگی ان کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک کٹے ہوئے درخت کے تنہ کے پاس وہ ٹھہرے اور اس پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ان کے دونوں جانب جا بیٹھے۔ ایک سیب کو گود میں رکھ لیا۔ اور دوسرے کے کھلے ہوئے چاقو سے برابر کے دو ٹکڑے کئے خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ۔

"خدا کی قسم۔ ادھر تو دیکھو" انہوں نے قسم کھاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ یہ انکی قدیم عادت تھی۔

احساس کرتے ہوئے چیخ اٹھے۔ کیونکہ سیب کے اوپر کا جامنی رنگ اس کے اندر رنگ سرایت کر گیا تھا۔ اور گودا ملال تھا۔ گویا سیب سرخ رنگ کو آتش سیال میں غوطہ دیا گیا ہے۔

"کبھی دیکھا" ابا نے کہا۔ میری اتنی عمر ہونے کو آئی۔ مگر میں نے تو کبھی نہیں۔" اس کو سیب کو سونگھتے ہوئے کہا۔ اور خوشبو کی یوں تعریف کی۔ گلدستہ ہے۔ تازہ پھولوں کا۔" پھر انھوں نے آدھا سیب بوگی کو اور آدھا مجھے دیا۔ اور دوسرے کو تراشنے لگے

میں بوگی کی طرف دیکھنے لگا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ دانتوں سے سیب کا ایک کڑا کاٹا۔ ہمارے منھ کوئی ایسی چیز سے بھر گئے جو آٹے کے سوکھے پیڑے کی سی ہو۔ سخت۔ بدمزا۔ ایک عجیب سی خوفناک بدمزگی کے ساتھ۔

"کیسا ہے؟" ابا نے خوش ہو کر پوچھا۔ وہ دوسرے سیب کو بھی آدھا کر چکے تھے۔ اور اب اس کے بیج نکال رہے تھے۔ "کیسا مزا ہے؟"

بوگی۔ اور میں بغیر پلک مارے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ہمت کر کے چباتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک پر لطف گفتگو ہم دونوں کے درمیان ہوئی۔ ایک معنی خیز تبسم ہمارے ہونٹوں پر کھیلنے لگا۔ ہم نے سیب کو نگلنے کی کوشش کی۔ اور والد کے قریب کھسکنے لگے۔ حتیٰ کہ ہمارے بدن ان کے کوٹ سے چھو گئے۔

"بہترین" ہم نے جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ "بہترین۔ نہایت ہی عمدہ"
مگر ہمارا کہنا لاحاصل تھا۔ والد نے اپنا ربع ٹکڑا منہ سے تھوک دیا۔ "پھر کبھی اس درخت کی شکل